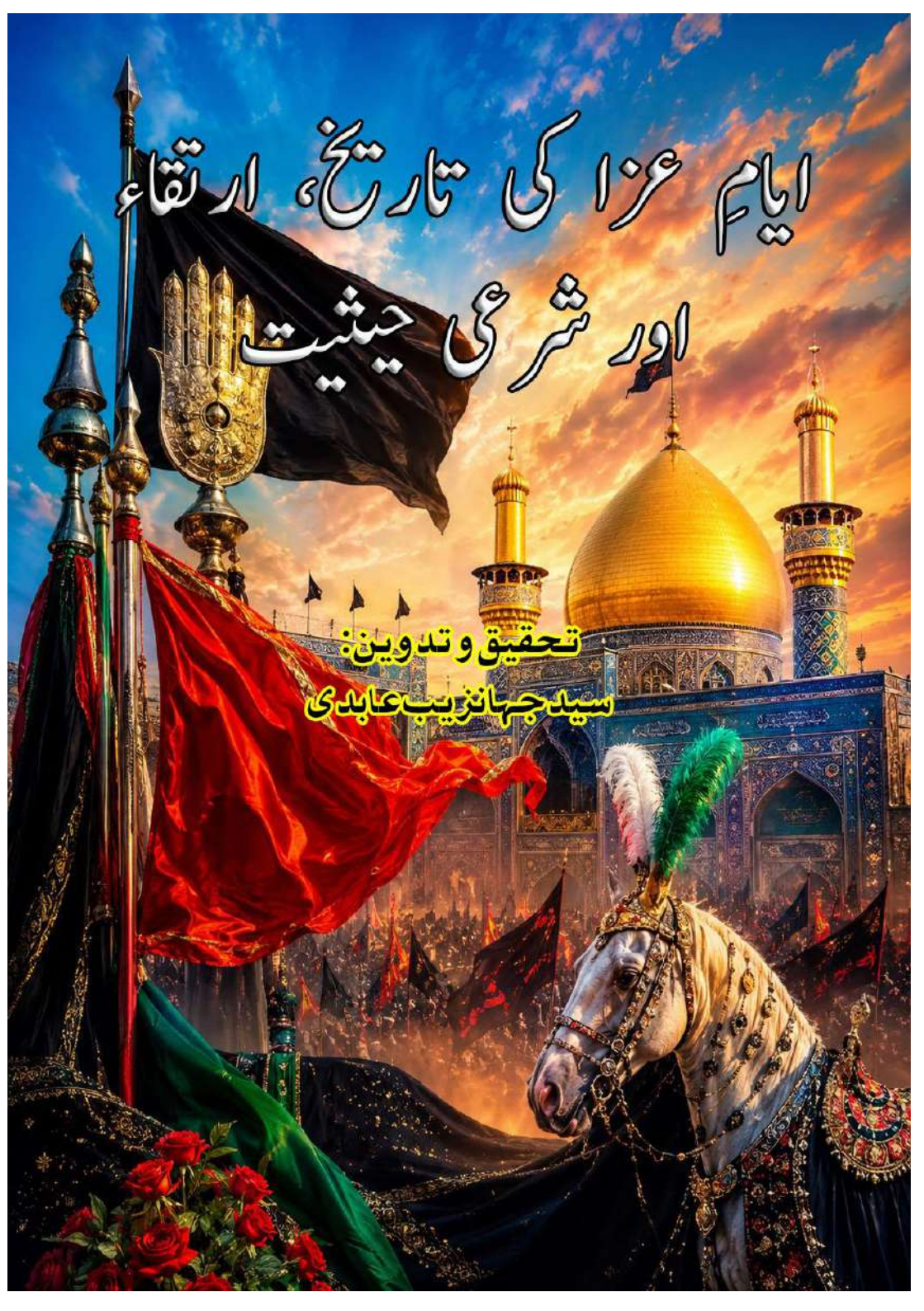
ایام عزا کی تاریخ، ارتقاء
اور شرعی حیثیت
تحقیق و تدوین:
سید جہانزیب عابدی

ایامِ عزا کی تاریخ، ارتقاء

اور شرعی حیثیت

(ایک تحقیقی و تاریخی مطالعہ)

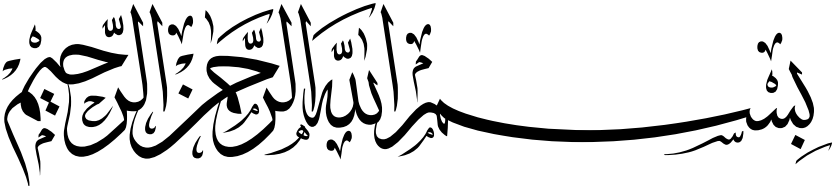

فہرست عناوین

باب اول 14

تمہید: کیا آج کی عزاداری بعینہٖ ائمہ اہل بیتؑ کے زمانے کی عزاداری ہے؟ 14

اس تحقیق کے بنیادی مراجع 17

تحقیق کا طریقۂ کار 18

باب دوم 20

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امام حسن عسکریؑ تک عزاداری کی مستند تاریخ 20

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعۂ کربلا کی خبر دی گئی تھی؟ 21

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گریہ 22

حضرت فاطمہ زہراؑ کی عزاداری 23

امام علیؑ کا کربلا سے گزرنا 23

واقعۂ عاشورا کے فوراً بعد عزاداری 24

مدینہ واپسی اور پہلی مجالس 25

امام باقرؑ کے دور میں عزاداری 26

امام جعفر صادقؑ اور مجالسِ عزا 27

اس باب کا اہم نتیجہ 29

باب سوم 31

امام موسیٰ کاظمؑ سے امام حسن عسکریؑ تک عزاداری کا ارتقاء 31
امام موسیٰ کاظمؑ کی سیرت 32
امام علی رضاؑ اور دعبل خزاعی کی مجلس 33
مرثیہ گوئی کی ترویج 34
زیارتِ عاشورا کی تدوین 35
امام ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ کا دور 36
زیارتِ اربعین 36
کیا اس دور میں جلوس موجود تھے؟ 37
اس باب کا خلاصہ 38
باب چہارم 40
آلِ بویہ کا دور (334ھ–447ھ): کیا عوامی عزاداری کی ابتدا اسی دور میں ہوئی؟ 40
آلِ بویہ کون تھے؟ 40
352 ہجری: پہلی سرکاری عاشورا 41
ابن کثیر کی شہادت 42
کیا یہی پہلے جلوس تھے؟ 43
کیا ماتم بھی اسی دور میں شروع ہوا؟ 44
کیا علم موجود تھے؟ 45
کیا شامِ غریباں ہوتی تھی؟ 46

اُس دور کے فقہا کا کردار 46
آلِ بویہ کی عزاداری کا تاریخی اثر 47
اس باب کا خلاصہ 48
اہم مراجع 49
باب پنجم 50
سلجوقی، ایلخانی اور صفوی ادوار میں عزاداری کا ارتقاء: موجودہ رسوم کی تشکیل کیسے ہوئی؟ 50
سلجوقیوں کا دور: عزاداری کی بقا کی جدوجہد 50
ایلخانی دور: شیعہ ثقافت کی وسعت 52
صفوی انقلاب اور عزاداری کی نئی شکل 52
حسینیہ اور تکیہ 54
منبر کا ارتقاء 54
روضہ خوانی کی ابتدا 55
تعزیہ اور شبیہ خوانی 56
علم اور پرچم 57
تحقیقی نتیجہ 58
اہم مراجع 58
باب ششم 60
برصغیر میں عزاداری کا ارتقاء: موجودہ اردو عزاداری کی تشکیل 60

برصغیر میں تشیع کی آمد 61
اودھ اور لکھنؤ: اردو عزاداری کا مرکز 62
امام بارگاہ کا ارتقاء 62
مرثیہ کی پیدائش 63
میر انیس اور مرزا دبیر میں فرق 64
نوحہ خوانی کا ارتقاء 64
ذوالجناح 65
علم 65
تعزیہ 66
سبیل 66
کیا یہ سب رسوم ائمہؑ نے مقرر کی تھیں؟ 67
تحقیقی نتیجہ 68
اہم مراجع 68
باب ہفتم 70
فقہائے جامع الشرائط نے بعد میں پیدا ہونے والی رسوم کو کس بنیاد پر جائز قرار دیا؟ 70
توقیفی عبادات اور عرفی شعائر میں فرق 71
"شعائر" کا قرآنی اصول 72
"احیائے امر اہل بیتؑ" کا اصول 74

"اصلِ اباحت" کا فقہی قاعدہ 75
"عنوانِ ثانوی" کی اہمیت 76
کیا فقہاء نے تمام رسوم کو مستحب قرار دیا؟ 77
تحقیقی نتیجہ 78
اہم مراجع 78
باب ہشتم 79
فقہائے امامیہ کی آراء: کیا موجودہ عزاداری کی تمام صورتوں کی تائید کی گئی ہے؟ 79
شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی 1281ھ) 80
میرزائے نائینی (متوفی 1355ھ) 81
سید محسن امین عاملی (متوفی 1371ھ) 82
امام خمینیؒ 82
آیت اللہ سید ابو القاسم خوئیؒ 83
آیت اللہ سید علی خامنہ ای 83
آیت اللہ سید علی سیستانی 84
آیت اللہ وحید خراسانی 85
آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی 85
کیا تمام فقہاء متفق ہیں؟ 86
تحقیقی نتیجہ 87

اہم مراجع 87

باب نہم 89

پہلی محرم سے ۹ ربیع الاول تک: موجودہ ایامِ عزا کی تاریخی بنیاد کیا ہے؟ 89

محرم کا آغاز: پہلی محرم 90

یکم سے نو محرم 91

سات محرم 91

آٹھ محرم 92

نو محرم (تاسوعا) 92

عاشورا (10 محرم) 93

گیارہ محرم 94

شامِ غریباں 94

بارہ محرم 95

تحقیقی نتیجہ 96

اہم مراجع 96

باب دہم 97

اربعین، ۲۸ صفر، ۸ ربیع الاول اور ۹ ربیع الاول: کیا ۹ ربیع الاول تک ایامِ عزا منانے کی شرعی و تاریخی بنیاد موجود ہے؟ 97

اربعین (۲۰ صفر) 98

کیا اسراء اربعین کے دن کربلا واپس آئے تھے؟ 98
جابر بن عبداللہ انصاری کی زیارت 99
کیا عاشورا سے اربعین تک مسلسل عزاداری ائمہؑ سے ثابت ہے؟ 100
۲۸ صفر 101
صفر کے پورے مہینے میں غم 102
۸ ربیع الاول 103
۹ ربیع الاول 103
کیا ۹ ربیع الاول تک مسلسل ایام عزا ائمہؑ نے مقرر کیے؟ 105
تحقیقی نتیجہ 106
اہم مراجع 107
باب یازدہم 108
علم، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، پنجہ، سبیل، سیاہ لباس، ماتم اور دیگر شعائرِ حسینی کی تاریخی ابتدا اور فقہی حیثیت 108
علم (پرچم) 109
ذوالجناح 110
تعزیہ اور تابوت 111
پنجہ 112
سبیل 113

تحقیقی نتیجہ 113
اہم مراجع 114
باب دوازدہم 115
سیاہ لباس، سینہ زنی، نوحہ، مرثیہ، زنجیر زنی، قمہ زنی، نذر و نیاز اور لنگر: تاریخی ارتقاء اور فقہی حیثیت 115
سیاہ لباس کی ابتدا 115
سینہ زنی (لطم) 117
موجودہ اجتماعی سینہ زنی 118
نوحہ خوانی 118
موجودہ نوحے 119
مرثیہ 120
زنجیر زنی 120
فقہاء کا موقف 121
قمہ زنی 121
نذر و نیاز 122
لنگر 123
شمعیں جلانا 123
مجموعی تحقیقی نتیجہ 124
اہم مراجع 125

باب سیز دہم 126
بدعت اور شعیرہ میں فرق: فقہِ جعفری کی روشنی میں عزاداری کا مستقبل 126
بدعت کا حقیقی مفہوم 127
شعیرہ کیا ہے؟ 127
شعائر کا ارتقاء: ایک فطری عمل 128
شعائر کی شرعی حدود 129
کیا ہر قدیم رسم ہمیشہ باقی رہے گی؟ 130
عزاداری کا اصل مقصد 131
اس تحقیق کا خلاصہ 133
اختتامی کلمات 134
اہم مراجع 134
باب چہاردہم (اختتامی باب) 136
ائمۂ اہل بیتؑ عزاداری سے کیا چاہتے تھے؟ رسم سے مقصد تک کا سفر 136
امام حسینؑ صرف مظلوم نہیں، رہبر بھی ہیں 137
عزاداری کا مقصد صرف رونا نہیں، انسان بنانا ہے 138
عزاداری اور تہذیب سازی 139
ہر دور کی عزاداری کا اپنا چیلنج 140
کیا عزاداری میں اصلاح کی گنجائش ہے؟ 141

اس باب کا حاصل 142

باب اول

تمہید: کیا آج کی عزاداری بعینہٖ ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے کی عزاداری ہے؟

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہبی یا تہذیبی عمل ہو جو چودہ صدیوں تک زندہ رہا ہو اور اس دوران اس کی ظاہری شکل میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خود مسجد، مدرسہ، منبر، وقف، دارالقضاء، حوزۂ علمیہ، کتب خانہ، یہاں تک کہ قرآنِ کریم کی طباعت اور نشر و اشاعت کے طریقے بھی مختلف ادوار میں ارتقاء پذیر ہوئے۔ ان میں اصل مقصد ہمیشہ محفوظ رہا، جبکہ اظہار کے ذرائع وقت، معاشرے اور تمدن کے ساتھ بدلتے رہے۔

امام حسینؑ کی عزاداری بھی اسی عمومی تاریخی اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص پہلی صدی ہجری کی عزاداری کا مشاہدہ کرے اور پھر اکیسویں صدی کے نجف، کربلا، قم، مشہد، کراچی، لاہور، لکھنؤ، بیروت یا لندن کی عزاداری کو دیکھے تو اسے واضح فرق نظر آئے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ اصل مقصد، یعنی امام حسینؑ کی یاد کو زندہ رکھنا،

ظلم کے خلاف شعور پیدا کرنا، اہل بیتؑ سے محبت کا اظہار کرنا اور واقعۂ کربلا کو نسل در نسل منتقل کرنا، تمام ادوار میں یکساں رہا ہے۔

یہیں سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ عزاداری کی تمام شکلیں خود ائمۂ اہل بیتؑ نے مقرر فرمائی تھیں؟ یا ان میں سے بعض بعد کے زمانوں میں وجود میں آئیں؟ اگر بعد میں وجود میں آئیں تو کیا وہ بدعت ہیں یا جائز شعائر؟ اور اگر جائز ہیں تو ان کے جواز کی بنیاد کیا ہے؟

یہ سوال نیا نہیں۔ چوتھی صدی ہجری سے لے کر آج تک شیعہ علماء اسی موضوع پر بحث کرتے آئے ہیں۔ بعض نے تاریخی پہلو پر تحقیق کی، بعض نے فقہی اصول بیان کیے، بعض نے عوامی رسوم کی اصلاح کی دعوت دی اور بعض نے ان رسوم کے ذریعے تشیع کی اجتماعی شناخت کو محفوظ رکھنے پر زور دیا۔

اس تحقیق میں ہمارا مقصد نہ کسی رسم کی اندھی تائید ہے اور نہ بلا دلیل تردید، بلکہ یہ جاننا ہے کہ تاریخ کیا کہتی ہے، حدیث کیا کہتی ہے، اور فقہائے جامع الشرائط نے کیا موقف اختیار کیا ہے۔

یہاں ایک اور بنیادی نکتہ بھی واضح کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر عوام "قدیم" اور "شرعی" کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں، جبکہ فقہ میں ایسا نہیں ہے۔ کوئی چیز

قدیم ہو سکتی ہے لیکن شرعی دلیل نہ رکھتی ہو، اور کوئی چیز نسبتاً نئی ہو سکتی ہے لیکن معتبر فقہی اصولوں کے تحت جائز ہو۔ اسی طرح کوئی عمل عوام میں بہت مقبول ہو سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ثابت نہ ہو۔

اسی لیے اس تحقیق میں ہر موضوع کو تین زاویوں سے دیکھا جائے گا۔

پہلا زاویہ تاریخی ہو گا کہ کسی رسم یا عمل کا آغاز کب ہوا اور اس کا سب سے قدیم تاریخی ثبوت کیا ہے۔

دوسرا زاویہ حدیثی ہو گا کہ آیا اس عمل کی کوئی بنیاد رسول اللہؐ یا ائمۂ اہل بیتؑ کی روایات میں موجود ہے یا نہیں۔

تیسرا زاویہ فقہی ہو گا کہ فقہائے شیعہ نے اس عمل کے بارے میں کیا حکم دیا اور وہ حکم کس اصول پر مبنی ہے۔

یہ طریقۂ تحقیق جدید تاریخ نگاری کا بھی تقاضا ہے اور فقہِ امامیہ کا بھی۔ شیعہ علماء نے ہمیشہ تاریخ، حدیث اور فقہ کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے سے روکا ہے۔ اسی لیے ایک روایت حدیث کی کتاب میں موجود ہو سکتی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے محلِ بحث ہو، یا کوئی تاریخی واقعہ ثابت ہو سکتا ہے مگر اس سے کوئی شرعی حکم ثابت نہ ہوتا ہو۔

اس تحقیق کے بنیادی مراجع

اس تحقیق کی بنیاد صرف ایک یا دو کتابوں پر نہیں بلکہ متعدد قدیم اور جدید مصادر پر رکھی جائے گی۔

قدیم تاریخی مصادر میں ابو مخنف کی مقتل الحسین جس کا بڑا حصہ طبری نے محفوظ کیا، محمد بن جریر طبری کی تاریخ الأمم والملوک، بلاذری کی أنساب الأشراف، دینوری کی الأخبار الطوال، شیخ مفید کی الإرشاد، سید ابن طاؤس کی اللھوف، ابن نما حلی کی مثیر الأحزان، اور علامہ مجلسی کی بحار الأنوار بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

حدیثی مصادر میں شیخ کلینی کی الکافی، شیخ صدوق کی الأمالی، عیون أخبار الرضا، ابن قولویہ کی کامل الزیارات، شیخ طوسی کی الأمالی، مصباح المتھجد اور تھذیب الأحکام سے استفادہ کیا جائے گا۔

فقہی مراجع میں شیخ انصاری، میرزائے نائینی، سید محسن حکیم، امام خمینی، آیت اللہ خوئی، آیت اللہ سید علی خامنہ ای، آیت اللہ سید علی سیستانی، آیت اللہ وحید خراسانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کے فتاویٰ اور استفتاءات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

جدید تاریخی تحقیقات میں رسول جعفریان، شہید مرتضیٰ مطہری، محدث نوری، Moojan Momen، Kamran Scot Aghaie، Yitzhak Nakash اور دیگر محققین کی تحقیقات سے بھی استفادہ کیا جائے گا، خصوصاً وہاں جہاں عزاداری کی ارتقائی تاریخ کا سوال ہو۔

تحقیق کا طریقۂ کار

اس پوری تحقیق میں ایک اصول ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے گا، اور وہ یہ کہ جہاں کسی تاریخی مسئلے میں علماء کا اختلاف ہو گا وہاں صرف ایک رائے بیان نہیں کی جائے گی بلکہ تمام اہم آراء کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی واقعہ عوام میں مشہور ہو لیکن اس کی سند ضعیف ہو تو اسے ضعیف ہی کہا جائے گا، اور اگر کوئی روایت معتبر ہو تو اس کی علمی حیثیت بھی واضح کی جائے گی۔

اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ امام حسینؑ نے حق اور باطل کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے جان قربان کی تھی، اس لیے ان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بھی علمی دیانت، تحقیق اور صداقت کا اہتمام ضروری ہے۔ جیسا کہ محدث نوری نے لؤلؤ و مرجان میں خطباء اور ذاکرین کو تاکید کی کہ مصائبِ حسینی بیان کرتے وقت غیر مستند واقعات کو یقینی تاریخ کے طور پر بیان نہ

کریں، اور شہید مرتضیٰ مطہری نے حماسۂ حسینی میں "تحریفاتِ عاشورا" کے عنوان سے اسی علمی ذمہ داری پر زور دیا۔

حوالہ جات (باب اول)

1. ابو مخنف، مقتل الحسین (منقول در: طبری، تاریخ الأمم والملوک، ج5)۔
2. شیخ مفید، الإرشاد، ج2۔
3. ابن قولویہ، کامل الزیارات۔
4. شیخ کلینی، الکافی۔
5. شیخ صدوق، الأمالی، عیون أخبار الرضا۔
6. شیخ طوسی، الأمالی، مصباح المتہجد، تہذیب الأحکام۔
7. علامہ مجلسی، بحار الأنوار، ج44–45۔
8. محدث نوری، لؤلؤ و مرجان۔
9. شہید مرتضیٰ مطہری، حماسۂ حسینی۔
10. رسول جعفریان، تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔

باب دوم

رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امام حسن عسکریؑ تک عزاداری کی مستند تاریخ

ایامِ عزا کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ عزاداری کی بنیاد کہاں سے شروع ہوئی۔ کیا یہ صرف واقعۂ کربلا (61ھ) کے بعد وجود میں آئی یا اس کی جڑیں خود رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے تک پہنچتی ہیں؟ اگر رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ اہل بیتؑ کی سیرت میں عزاداری کی کوئی بنیاد موجود ہے تو پھر یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اس دور میں عزاداری کی عملی صورت کیا تھی، اور آج رائج بہت سی رسوم میں سے کون سی چیزیں اس دور میں موجود نہیں تھیں۔

یہاں ایک بنیادی اصول سامنے رکھنا ضروری ہے کہ ہم اس باب میں صرف پہلی تین صدیوں ہجری کے معتبر تاریخی اور حدیثی مصادر سے گفتگو کریں گے، بعد کے عوامی رواج کو ان پر منطبق نہیں کریں گے۔

کیا رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعۂ کربلا کی خبر دی گئی تھی؟

شیعہ اور اہل سنت دونوں کے متعدد قدیم مصادر میں یہ روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت امام حسینؑ کی آئندہ شہادت کی خبر دی گئی تھی۔ ان روایات کی اسناد کا درجہ یکساں نہیں، لیکن مجموعی طور پر ان کی کثرت نے بہت سے محدثین کو اس نتیجے تک پہنچایا کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کربلا کے واقعے کی اجمالی اطلاع دی گئی تھی۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے منقول روایت میں آتا ہے کہ جبرائیلؑ نے رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کربلا کی مٹی دکھائی اور امام حسینؑ کی شہادت کی خبر دی۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مٹی ام سلمہؓ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ جب یہ مٹی خون میں تبدیل ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میرا حسینؑ شہید ہو گیا۔

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ شیعہ اور سنی مصادر میں نقل ہوئی ہے۔

حوالہ:

- شیخ صدوق، الأمالی، مجلس 30۔

- شیخ مفید، الارشاد، ج2۔
- احمد بن حنبل، المسند، ج6۔
- حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، ج4۔

یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف خبر نہیں دی بلکہ اس مصیبت پر غم بھی ظاہر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والی مصیبت پر اظہارِ حزن خود سنتِ نبویؐ میں موجود ہے۔

رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گریہ

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسینؑ کو گود میں لیا، رونے لگے اور صحابہ کے سوال پر فرمایا کہ جبرائیلؑ نے مجھے بتایا ہے کہ میری امت میرے اس بیٹے کو عراق کی سرزمین میں شہید کرے گی۔

یہ روایت اگرچہ مختلف سندوں سے منقول ہے، لیکن متعدد طرق کی بنا پر اس کا اصل مضمون تاریخی طور پر معروف ہے۔

یہاں ایک نہایت اہم فقہی نکتہ سامنے آتا ہے۔

عزاداری کا پہلا عمل "گریہ" ہے، اور اس کی ابتدا خود رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہوتی ہے۔
لیکن یہاں نہ کوئی جلوس تھا، نہ ماتم، نہ علم، نہ تعزیہ اور نہ ہی کوئی منظم مجلس۔
یہ فرق بعد کی پوری بحث میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کی عزاداری

شیعہ روایات کے مطابق حضرت زہراؑ کو بھی واقعۂ کربلا کی اطلاع دی گئی تھی۔
البتہ یہ روایات زیادہ تر شیعہ حدیثی مصادر میں موجود ہیں اور ان کے اسناد پر محدثین نے الگ الگ گفتگو کی ہے۔
ان روایات کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اہل بیتؑ کے نزدیک امام حسینؑ کی شہادت پہلے سے معلوم عظیم مصیبت تھی۔
حوالہ
شیخ صدوق، علل الشرائع۔

امام علیؑ کا کربلا سے گزرنا

صفین جاتے ہوئے امام علیؑ جب سرزمین کربلا پہنچے تو آپؑ نے اس مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"یہاں ایک قوم شہید ہو گی جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گی۔"

بعد ازاں آپؑ نے گریہ فرمایا۔

یہ واقعہ متعدد تاریخی مصادر میں مذکور ہے۔

حوالہ

- نصر بن مزاحم، وقعۃ صفین۔
- شیخ مفید، الإرشاد۔
- علامہ مجلسی، بحار الأنوار، ج 41۔

یہاں بھی صرف گریہ، ذکرِ مصیبت اور خبرِ غیب ملتی ہے، نہ کہ موجودہ عزاداری کی اجتماعی شکلیں۔

واقعۂ عاشورا کے فوراً بعد عزاداری

یہاں سے عزاداری کی حقیقی عملی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

61 ہجری میں عاشورا کے بعد سب سے پہلے عزادار کون تھے؟

تاریخ کا جواب ہے:

خود اہل بیتؑ۔

جب قافلۂ اسرا کو کوفہ اور شام لے جایا گیا تو متعدد مقامات پر حضرت زینبؑ، امام سجادؑ اور دیگر اہل بیتؑ نے خطبات دیے۔

یہ خطبات صرف سیاسی تقریریں نہیں تھے بلکہ درحقیقت پہلی مجالسِ عزا بھی تھے، کیونکہ ان میں واقعۂ کربلا کو بیان کیا گیا، شہداء کا تعارف کرایا گیا اور امت کو ان کے مقام سے آگاہ کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض معاصر محققین کہتے ہیں کہ:

پہلا ذاکر امام حسینؑ خود امام زین العابدینؑ تھے اور پہلی خطیبۂ کربلا حضرت زینبؑ تھیں۔

اگرچہ یہ جملہ روایات کا متن نہیں بلکہ ایک علمی تجزیہ ہے، لیکن تاریخی اعتبار سے درست معلوم ہوتا ہے۔

مدینہ واپسی اور پہلی مجالس

قافلہ جب مدینہ واپس آیا تو شہر میں شدید غم کی فضا تھی۔

امام سجادؑ کی پوری زندگی کربلا کی یاد سے عبارت نظر آتی ہے۔

شیخ مفید اور دیگر مؤرخین لکھتے ہیں کہ آپؑ جب بھی پانی دیکھتے گریہ فرماتے۔ جب کھانا سامنے آتا تو روتے۔

لوگ پوچھتے:

"اے فرزند رسول! کیا آپ کا غم کبھی ختم نہیں ہو گا؟"

آپؑ فرماتے:

"یعقوبؑ نے صرف ایک بیٹے کی جدائی میں اتنا رویا کہ ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، جبکہ میں نے اپنے سامنے اپنے خاندان کے اٹھارہ افراد کو شہید ہوتے دیکھا ہے۔"

حوالہ

- شیخ مفید، الإرشاد، ج2۔
- ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج4۔
- علامہ مجلسی، بحار الأنوار، ج46۔

یہ روایت عزاداری کی روح کو بیان کرتی ہے، لیکن یہاں بھی موجودہ اجتماعی رسوم کا ذکر نہیں۔

امام باقرؑ کے دور میں عزاداری

امام باقرؑ (95-114ھ) کے زمانے میں اموی حکومت کمزور ہونا شروع ہوئی۔

اس نسبتاً نرم ماحول میں اہل بیتؑ نے پہلی مرتبہ منظم انداز میں زیارت، مرثیہ اور مصائبِ کربلا کی تعلیم دینا شروع کی۔

امام باقرؑ سے عاشورا کی زیارت نقل ہوئی۔

آپؑ نے اپنے شیعوں کو عاشورا کے دن گریہ، دعا اور سلام پڑھنے کی تعلیم دی۔

یہاں پہلی مرتبہ عزاداری کی بعض عملی ہدایات حدیث کی صورت میں محفوظ ہوئیں۔

حوالہ

ابن قولویہ، کامل الزیارات، ابواب 71 تا 79۔

امام جعفر صادقؑ اور مجالسِ عزا

اگر یہ پوچھا جائے کہ مجالسِ عزا کی سب سے واضح بنیاد کس امام کے زمانے میں ملتی ہے؟

تو جواب ہو گا:

امام جعفر صادقؑ۔

آپؑ کے زمانے میں پہلی مرتبہ ہمیں باقاعدہ ایسی روایات ملتی ہیں جن میں:

مجلس منعقد کرنا،

شعر پڑھنا،

نوحہ پڑھنا،

گریہ کرنا،

مصائب سنانا،

دوسروں کو جمع کرنا،

اور اہل بیتؑ کے امر کو زندہ رکھنا

واضح طور پر بیان ہوا ہے۔

امام صادقؑ نے فضیل بن یسار سے فرمایا:

"کیا تم لوگ اکٹھے بیٹھتے ہو اور ہماری احادیث بیان کرتے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا:

جی ہاں۔

امامؑ نے فرمایا:

"میں ایسی مجلسوں کو پسند کرتا ہوں۔"

"ہمارے امر کو زندہ رکھو۔"

"اللہ اس شخص پر رحم کرے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔"

حوالہ

- شیخ کلینی، الکافی، ج2، باب التذاکر۔
- شیخ حر عاملی، وسائل الشیعۃ، ج10۔

یہ روایت عزاداری کے پورے فقہی فلسفے کی بنیادوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے۔

اس باب کا اہم نتیجہ

پہلی صدی ہجری سے امام جعفر صادقؑ کے دور تک کے مستند تاریخی اور حدیثی شواہد سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

اول، امام حسینؑ پر گریہ، مصائب کا بیان، مرثیہ خوانی، زیارت، اہل بیتؑ کی یاد کو زندہ رکھنا اور مجلس منعقد کرنا ائمۂ اہل بیتؑ کی تعلیمات سے ثابت ہے۔

دوم، اس دور میں علم، جلوس، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، شبیہ، سیاہ پرچموں کے منظم جلوس، شامِ غریباں کی موجودہ صورت، اور دیگر بعد کی ثقافتی رسوم کا کوئی واضح تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

یہ عدمِ ثبوت، ان کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ صرف یہ بتاتا ہے کہ ان کی تاریخی ابتدا بعد کے ادوار میں ہوئی۔ ان کی شرعی حیثیت کا فیصلہ الگ فقہی اصولوں کی بنیاد پر ہو گا، جس پر ہم بعد کے ابواب میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

باب سوم

امام موسیٰ کاظمؑ سے امام حسن عسکریؑ تک عزاداری کا ارتقاء

پچھلی باب میں ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم ، امیر المؤمنینؑ، حضرت زہراؑ، امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے زمانے میں عزاداری کی بنیادی صورتیں کیا تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد، یعنی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں، عزاداری نے کس طرح ارتقاء پایا؟ کیا اس دور میں کوئی نئی صورت پیدا ہوئی؟ اور کیا ائمۂ اہل بیتؑ نے ان کی تائید فرمائی؟

اس مرحلے کو سمجھنے کے لیے اس دور کے سیاسی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک تقریباً ایک صدی کا زمانہ عباسی خلافت کے زیرِ اقتدار گزرا۔ اگرچہ عباسیوں نے ابتدا میں "آلِ محمدؐ" کے نام پر اقتدار حاصل کیا، لیکن حکومت مضبوط ہونے کے بعد انہوں نے بھی اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے برسوں قید میں گزارے، امام رضاؑ کو خراسان بلایا گیا، امام جوادؑ، امام

ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ مسلسل حکومتی نگرانی میں رہے۔ ایسے ماحول میں کسی وسیع عوامی جلوس یا کھلے عام اجتماعی عزاداری کا امکان بہت محدود تھا۔ اسی لیے اس دور کی عزاداری زیادہ تر گھروں، محدود مجالس، زیارت، مرثیہ خوانی اور علمی حلقوں کی صورت میں جاری رہی۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی سیرت

امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ محرم کا چاند نظر آتے ہی آپؑ کے چہرے پر غم نمایاں ہو جاتا تھا۔ یہ روایت امام رضاؑ نے نقل فرمائی ہے:

"جب محرم آتا تو میرے والد کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا جاتا تھا، غم ان پر غالب رہتا، یہاں تک کہ عاشورا کا دن آ جاتا، اور عاشورا ان کے غم، گریہ اور مصیبت کا دن ہوتا تھا۔"

یہ روایت نہایت اہم ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر تک محرم کو غم کے مہینے کے طور پر منانے کی ایک واضح عملی روایت اہل بیتؑ کے گھرانے میں موجود تھی۔

حوالہ:

شیخ صدوق، عیون أخبار الرضا، ج 2، باب 27؛ علامہ مجلسی، بحار الأنوار، ج 44۔

یہاں بھی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ روایت میں غم، گریہ اور عاشورا کا ذکر ہے، لیکن کسی مخصوص اجتماعی رسم کی تعیین نہیں کی گئی۔

امام علی رضاؑ اور دعبل خزاعی کی مجلس

امام رضاؑ کے زمانے میں ہمیں پہلی مرتبہ ایک ایسی مجلس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جسے موجودہ اصطلاح میں "مجلسِ عزا" کہا جاسکتا ہے۔

مشہور شاعر دعبل بن علی خزاعی (متوفی 246ھ) امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت محرم کا مہینہ تھا۔ امامؑ نے فرمایا:

"اے دعبل! یہ وہ دن ہیں جن میں ہمارے دشمن خوش ہوتے ہیں اور ہمارے دوست غمگین رہتے ہیں۔"

پھر امامؑ نے فرمایا کہ تم وہ مرثیہ سناؤ جو تم نے ہمارے لیے کہا ہے۔

دعبل نے اپنا مشہور قصیدہ "مدارس آیات "پڑھا۔ روایت میں آتا ہے کہ امام رضاؑ خود بھی روئے، اہلِ خانہ بھی روئے، اور پردے کے پیچھے موجود خواتین بھی گریہ کرنے لگیں۔

یہ روایت عزاداری کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں کئی عناصر پہلی مرتبہ واضح طور پر جمع ہوتے ہیں:

محرم کا انتخاب، مرثیہ خوانی، سامعین کا اجتماع، اہلِ بیتؑ کی موجودگی، اور اجتماعی گریہ۔

حوالہ:

شیخ صدوق، عیون أخبار الرضا، ج2؛ الأمالی؛ علامہ مجلسی، بحار الأنوار، ج49۔

یہ روایت مجالسِ عزا کی شرعی بنیادوں میں شمار کی جاتی ہے، اگرچہ اس کی شکل آج کی وسیع عوامی مجالس سے مختلف تھی۔

مرثیہ گوئی کی ترویج

امام رضاؑ نے صرف دعبل ہی کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اہل بیتؑ کے مصائب پر شعر کہنے کو عظیم ثواب کا باعث قرار دیا۔

اسی طرح امام صادقؑ کے دور میں ابو ہارون مکفوف اور جعفر بن عفان جیسے شعراء کو بھی مرثیہ پڑھنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ خوانی، شعر کے ذریعے مصائب بیان کرنا اور گریہ پیدا کرنا ائمہؑ کی تائید یافتہ سنتوں میں شامل تھا۔

حوالہ:

شیخ صدوق، الأمالی؛ شیخ طوسی، الأمالی؛ ابن قولویہ، کامل الزیارات۔

زیارتِ عاشورا کی تدوین

تیسری صدی ہجری تک آتے آتے زیارتِ عاشورا شیعہ معاشرے کا اہم ترین عبادی و اجتماعی سرمایہ بن چکی تھی۔

یہ زیارت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے اور شیخ طوسی نے اسے مصباح المتہجد میں، جبکہ ابن قولویہ نے اس کے مضامین کو کامل الزیارات میں محفوظ کیا ہے۔

زیارتِ عاشورا میں تین بنیادی عناصر نمایاں ہیں:

امام حسینؑ پر سلام، قاتلوں پر براءت، اور ظلم کے خلاف دائمی موقف۔

یہ تینوں عناصر بعد کی پوری عزاداری کی فکری بنیاد بن گئے۔

حوالہ:

ابن قولویہ، کامل الزیارات؛ شیخ طوسی، مصباح المتہجد۔

امام ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ کا دور

تیسری صدی ہجری کے وسط تک عباسی حکومت اہل بیتؑ پر پہلے سے زیادہ سخت ہو چکی تھی۔

امام ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ سامرہ میں تقریباً نظر بند زندگی گزار رہے تھے۔

اس دور میں بھی عزاداری کی روایت ختم نہیں ہوئی بلکہ محدود دائرے میں جاری رہی۔

اسی زمانے میں شیعہ معاشرے میں زیارات کی تدوین، دعاؤں کی حفاظت اور اہل بیتؑ کی تعلیمات کو تحریری شکل دینے کا کام تیزی سے ہوا۔

یہی وہ دور ہے جس نے بعد کی شیعہ ثقافت کی علمی بنیادیں فراہم کیں۔

زیارتِ اربعین

امام حسن عسکریؑ سے ایک مشہور روایت نقل ہوئی ہے:

"مؤمن کی پانچ نشانیاں ہیں: اکیاون رکعت نماز، دائیں ہاتھ میں انگوٹھی، سجدۂ خاک، بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا، اور زیارتِ اربعین۔"

یہ روایت اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے اربعین کی زیارت کو ایک نمایاں دینی شعار کے طور پر متعارف کرایا۔

البتہ یہ روایت صرف زیارتِ اربعین کے بارے میں ہے، نہ کہ موجودہ کروڑوں افراد کے پیدل مارچ یا عالمی اجتماعات کے بارے میں۔ یہ بعد کے ادوار میں تدریجاً وجود میں آنے والی صورتیں ہیں۔

حوالہ:

شیخ طوسی، تھذیب الأحکام، ج6؛ مصباح المتھجد۔

کیا اس دور میں جلوس موجود تھے؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔

پہلی تین صدیوں کے معتبر شیعہ اور سنی تاریخی مصادر میں ہمیں عوامی سڑکوں پر منظم ماتمی جلوس، علم، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، شبیہ، سبیل، شامِ غریباں کی موجودہ اجتماعی شکل، یا نوحہ خوانی کے باقاعدہ جلوسوں کا کوئی واضح اور قابلِ اعتماد ثبوت نہیں ملتا۔

یہ خاموشی خود ایک تاریخی حقیقت ہے۔
اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تمام امور ناجائز تھے، بلکہ صرف یہ کہ ان کی تاریخی پیدائش بعد کی صدیوں میں ہوئی۔
یہی وجہ ہے کہ جب چوتھی صدی ہجری میں آلِ بویہ کے دور میں پہلی مرتبہ سرکاری سطح پر عاشورا کے جلوسوں کا ذکر ملتا ہے تو مؤرخین اسے ایک نئی تاریخی پیش رفت کے طور پر بیان کرتے ہیں، نہ کہ پہلے سے موجود روایت کے تسلسل کے طور پر۔

اس باب کا خلاصہ

امام موسیٰ کاظمؑ سے امام حسن عسکریؑ تک کے دور میں عزاداری کی مستند صورتیں یہ تھیں: محرم میں غم واندوہ کا اظہار، عاشورا کے دن خصوصی حزن، مرثیہ خوانی، اہل بیتؑ کے مصائب کا بیان، زیارتِ عاشورا، زیارتِ اربعین، محدود اجتماعی مجالس، اور گریہ۔ ان تمام امور کی بنیاد معتبر حدیثی اور تاریخی مصادر میں ملتی ہے۔
اس کے برعکس، آج رائج بہت سی اجتماعی اور ثقافتی رسوم اس دور کے مصادر میں موجود نہیں ملتیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا نہ ان رسوم کی نفی ہے اور نہ

ان کی حرمت کا اعلان، بلکہ صرف ایک تاریخی مشاہدہ ہے۔ ان کی شرعی حیثیت کا فیصلہ بعد میں فقہائے امامیہ نے دوسرے اصولوں کی بنیاد پر کیا، جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔

باب چہارم

آلِ بویہ کا دور (334ھ–447ھ): کیا عوامی عزاداری کی ابتدا اسی دور میں ہوئی؟

تاریخِ عزاداری کا مطالعہ کرتے ہوئے چوتھی صدی ہجری ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک عزاداری کی اصل بنیادیں گریہ، مرثیہ، زیارت، محدود مجالس اور اہل بیتؑ کے مصائب کے بیان پر قائم تھیں۔ لیکن ان تین صدیوں کے معتبر تاریخی مآخذ میں ہمیں منظم عوامی جلوس، بازاروں کی سرکاری بندش، شہروں کی سطح پر اجتماعی ماتم اور حکومتی سرپرستی میں عزاداری کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔

چوتھی صدی ہجری میں پہلی مرتبہ ہمیں ایسی مستند تاریخی شہادتیں ملتی ہیں جن میں عاشورا کی عزاداری نجی گھروں سے نکل کر عوامی زندگی کا حصہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تبدیلی آلِ بویہ (بنو بویہ) کی حکومت کے زمانے میں رونما ہوئی۔

آلِ بویہ کون تھے؟

آلِ بویہ دیلم (شمالی ایران) سے تعلق رکھنے والا ایک شیعہ خاندان تھا، جس کے تین بھائی—علی، حسن اور احمد—دسویں صدی عیسوی میں طاقتور ہوئے۔ احمد بن بویہ، جسے معزّ الدولہ کا لقب ملا، 334ھ / 945ء میں بغداد میں داخل ہوا اور عباسی خلیفہ کو برقرار رکھتے ہوئے اصل سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آلِ بویہ نے عباسی خلافت کو ختم نہیں کیا بلکہ اسے برقرار رکھا، مگر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالی۔ اس کے نتیجے میں پہلی مرتبہ بغداد میں شیعہ مذہبی شعائر کو نسبتاً آزادی ملی۔

حوالہ:

- الکامل فی التاریخ، ج8۔
- تاریخ الإسلام۔
- البدایۃ والنہایۃ، ج11۔

352 ہجری: پہلی سرکاری عاشورا

تاریخ میں سب سے اہم واقعہ 352 ہجری (963ء) کا ہے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ معزّ الدولہ نے حکم دیا کہ عاشورا کے دن:

بازار بند رہیں۔

خرید و فروخت نہ ہو۔

قصاب ذبح نہ کریں۔

لوگ سیاہ لباس پہنیں۔

عورتیں کھلے عام نوحہ کرتی ہوئی نکلیں۔

شہر میں غم کا اظہار کیا جائے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں:

"اس سال معزّ الدولہ نے عاشورا کے دن لوگوں کو بازار بند کرنے، خرید و فروخت روکنے اور نوحہ وماتم کرنے کا حکم دیا۔"

حوالہ:

الکامل فی التاریخ، حوادث سنہ 352ھ۔

یہ روایت اس موضوع کی بنیادی تاریخی شہادت ہے۔

ابن کثیر کی شہادت

اہل سنت کے معروف مؤرخ ابن کثیر بھی اسی واقعے کو نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

شیعہ عورتیں سروں کو کھول کر اور چہرے پیٹتی ہوئی بازاروں میں نکلیں۔

شہر میں نوحہ ہوا۔

دکانیں بند رہیں۔

عاشورا کو عام سوگ کا دن بنایا گیا۔

اگرچہ ابن کثیر اس عمل سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن بطور مؤرخ انہوں نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے۔

حوالہ:

البدایۃ والنہایۃ، ج11، حوادث سنہ 352ھ۔

یہاں ایک اہم اصول سامنے آتا ہے۔

اگر کسی واقعے کو مخالف مکتبِ فکر کے مؤرخ بھی نقل کریں تو اس کی تاریخی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اسی لیے آلِ بویہ کی اس سرکاری عزاداری کو تقریباً تمام جدید مؤرخین ایک تاریخی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔

کیا یہی پہلے جلوس تھے؟

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

کیا352 ہجری سے پہلے کسی جگہ کوئی جلوس نہیں نکلتا تھا؟
اس سوال کا قطعی جواب دینا مشکل ہے۔
ممکن ہے بعض شیعہ علاقوں میں محدود پیمانے پر اجتماعی عزاداری ہوتی رہی ہو۔
لیکن آج تک کوئی معتبر تاریخی ماخذ ایسا نہیں ملا جس میں 352 ہجری سے پہلے عوامی سرکاری جلوسوں کی واضح تفصیل موجود ہو۔
اسی لیے مؤرخین کہتے ہیں کہ:
352 ہجری پہلا مستند تاریخی ثبوت ہے، نہ کہ لازماً پہلا وقوع۔
یہ فرق علمی دیانت کے لیے نہایت ضروری ہے۔

کیا ماتم بھی اسی دور میں شروع ہوا؟

یہاں لفظ "ماتم" کی وضاحت ضروری ہے۔
عربی مصادر میں اس دور کے لیے الفاظ جیسے:
النواح
اللطم
الجزع

استعمال ہوئے ہیں۔

لطم کا لغوی معنی ہے:

چہرہ یا سینہ پیٹنا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی ماتم کی ابتدائی شکلیں چوتھی صدی تک واضح طور پر رائج ہو چکی تھیں۔

لیکن یہ آج کی منظم سینہ زنی کے جلوسوں جیسی تھیں یا نہیں؟

تاریخ خاموش ہے۔

ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اجتماعی گریہ، نوحہ اور لطم موجود تھے۔

کیا علم موجود تھے؟

352 ہجری کے کسی مستند تاریخی بیان میں علم کا ذکر نہیں ملتا۔

اسی طرح:

ذوالجناح

تعزیہ

تابوت

شبیہ

وغیرہ کا بھی ذکر نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک اگر یہ چیزیں کہیں موجود بھی تھیں تو کم از کم بغداد کی اس سرکاری عزاداری کا نمایاں حصہ نہیں تھیں۔

کیا شامِ غریباں ہوتی تھی؟

چوتھی صدی کے تاریخی مآخذ میں "شامِ غریباں" بطور مستقل رسم ذکر نہیں ہوئی۔

یہ رسم غالباً بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ وجود میں آئی، جس کا تفصیلی جائزہ صفوی دور کے باب میں آئے گا۔

اُس دور کے فقہا کا کردار

یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ کیا اس زمانے کے فقہائے امامیہ نے ان اجتماعات کی مخالفت کی؟

تاریخی مصادر میں ایسی کوئی واضح شہادت موجود نہیں کہ شیخ صدوق (متوفی381ھ) یا شیخ مفید (متوفی413ھ) نے آلِ بویہ کی ان سرکاری عزاداریوں کی مذمت کی ہو۔

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان بزرگ فقہاء نے اپنی فقہی کتابوں میں ان جلوسوں کو کسی مستقل شرعی عبادت کے طور پر بھی بیان نہیں کیا۔

یہ خاموشی خود ایک اہم تاریخی اشارہ ہے۔

گویا:

اصل عزاداری پر اتفاق تھا۔

اجتماعی اظہار کو عرفی طریقہ سمجھا جاتا تھا۔

اسے نماز یا روزے کی طرح مستقل عبادت قرار نہیں دیا گیا۔

آلِ بویہ کی عزاداری کا تاریخی اثر

چوتھی صدی کی اس سرکاری سرپرستی نے عزاداری کی تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے۔

پہلی مرتبہ عاشورا پورے شہر کا اجتماعی دنِ سوگ بنا۔

شیعہ شناخت زیادہ نمایاں ہوئی۔

عوامی مجالس کو وسعت ملی۔
نوحہ خوانی گھروں سے نکل کر سماجی سطح پر پہنچی۔
بعد کی تمام شیعہ حکومتوں نے کسی نہ کسی درجے میں اسی روایت کو آگے بڑھایا۔
لیکن اس مرحلے پر بھی موجودہ عزاداری کی بہت سی معروف رسوم ابھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔

اس باب کا خلاصہ

چوتھی صدی ہجری، خصوصاً 352ھ، عزاداری کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال پہلی مرتبہ بغداد میں آلِ بویہ کی سرپرستی میں عاشورا کی سرکاری تعطیل، بازاروں کی بندش، اجتماعی نوحہ اور عوامی ماتم کا مستند تاریخی ذکر ملتا ہے۔ اس سے قبل عزاداری کی اصل بنیادیں موجود تھیں، لیکن ان کی شکل زیادہ تر گھریلو، محدود اور نیم خفیہ تھی۔ آلِ بویہ کے دور نے عزاداری کو نجی دائرے سے نکال کر ایک اجتماعی اور سماجی شعار کی صورت دی۔ تاہم اس دور میں بھی علم، ذوالجناح، تعزیہ، شامِ غریباں کی موجودہ شکل، تابوت اور بعد کی بہت سی رسوم کا واضح تاریخی ثبوت ابھی سامنے نہیں آتا۔

اہم مراجع

1. الکامل فی التاریخ، ج8، حوادث 352ھ۔
2. البدایۃ والنہایۃ، ج11، حوادث 352ھ۔
3. تاریخ الإسلام۔
4. الإرشاد۔
5. تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔

باب پنجم

سلجوقی، ایلخانی اور صفوی ادوار میں عزاداری کا ارتقاء: موجودہ رسوم کی تشکیل کیسے ہوئی؟

آلِ بویہ کے دور میں پہلی مرتبہ عاشورا کی عزاداری سرکاری سرپرستی میں عوامی سطح پر ظاہر ہوئی، لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ عزاداری کی وہ شکل، جسے آج ایران، عراق، پاکستان، ہندوستان، لبنان اور دنیا کے دوسرے شیعہ معاشروں میں دیکھا جاتا ہے، چوتھی صدی میں مکمل طور پر وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ کئی صدیوں کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

یہ بات سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ مذہبی ثقافتیں ہمیشہ یکبارگی وجود میں نہیں آتیں بلکہ وقت، معاشرت، سیاست، فنون، زبان اور تہذیب کے باہمی تعامل سے بتدریج تشکیل پاتی ہیں۔ عزاداری بھی اسی اصول کے مطابق مختلف تاریخی مراحل سے گزری۔

سلجوقیوں کا دور: عزاداری کی بقا کی جدوجہد

پانچویں صدی ہجری میں سلجوقیوں کے اقتدار کے بعد بغداد اور ایران کے مختلف علاقوں میں اہل تشیع پر دوبارہ دباؤ بڑھا۔ آلِ بویہ کی سرپرستی ختم ہو گئی اور بہت سے شیعہ شعائر محدود ہو گئے۔

تاہم اس دور کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اگرچہ سرکاری سطح پر عزاداری کی آزادی کم ہو گئی، لیکن علمی اور مذہبی حلقوں میں اس کا تسلسل برقرار رہا۔ نجف، کربلا، حلہ اور بعض ایرانی شہروں میں علماء، محدثین اور زائرین نے امام حسینؑ کی یاد کو زندہ رکھا۔

اسی زمانے میں مقتل نگاری مزید منظم ہوئی۔ سید ابن طاؤس (متوفی 664ھ) کی کتاب اللھوف علی قتلی الطفوف بعد کی تمام مجالسِ عزا پر گہرے اثرات مرتب کرنے والی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب صفوی دور سے پہلے لکھی گئی، لیکن صفوی عہد میں یہی کتاب ذاکروں اور خطباء کے ہاتھوں میں بنیادی ماخذ بن گئی۔

اسی دور میں ابن نما حلی کی مثیر الأحزان اور بعد ازاں علامہ حلی کے علمی حلقوں نے واقعۂ کربلا کی روایت کو فقہی اور حدیثی بنیادوں کے ساتھ محفوظ رکھا۔

اس مرحلے میں عزاداری کا مرکز زیادہ تر مجلس تھی، نہ کہ جلوس۔

ایلخانی دور: شیعہ ثقافت کی وسعت

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں منگولوں کی حکومت کے بعد، خصوصاً سلطان محمد خدابندہ (اولجایتو) کے دور میں، شیعہ علماء کو نسبتاً بہتر مواقع حاصل ہوئے۔

علامہ حلی کی علمی خدمات نے شیعہ فقہ کو مضبوط کیا، اگرچہ اس زمانے میں بھی موجودہ تعزیہ یا ذوالجناح کی واضح تاریخی شہادتیں بہت کم ملتی ہیں۔

البتہ اس دور میں چند اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

پہلی تبدیلی یہ تھی کہ مقتل خوانی ایک منظم فن بنتی گئی۔

دوسری تبدیلی یہ کہ عاشورا کے اجتماعات پہلے سے زیادہ منظم ہوئے۔

تیسری تبدیلی یہ کہ شاعری اور مرثیہ گوئی نے عوامی سطح پر زیادہ اثر پیدا کرنا شروع کیا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جس نے بعد کے صفوی دور کے لیے فکری اور ادبی بنیاد فراہم کی۔

صفوی انقلاب اور عزاداری کی نئی شکل

907ہجری (1501ء) میں صفوی حکومت کے قیام نے عزاداری کی پوری تاریخ کا رخ بدل دیا۔

شاہ اسماعیل صفوی نے ایران میں اثنا عشری تشیع کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس فیصلے کے بعد حکومت نے صرف فقہ یا عقائد ہی نہیں بلکہ مذہبی شعائر کی بھی سرپرستی شروع کی۔

یہاں سے عزاداری ایک محدود مذہبی عمل سے بڑھ کر ایک قومی اور تہذیبی شناخت بننے لگی۔

جدید مؤرخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ موجودہ عزاداری کی بہت سی معروف صورتیں صفوی دور میں منظم ہوئیں یا غیر معمولی فروغ حاصل کر گئیں، اگرچہ ان میں سے بعض کے ابتدائی آثار اس سے پہلے بھی موجود تھے۔

حوالہ:

- The Martyrs of Karbala۔
- An Introduction to Shi'i Islam۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔

حسینیہ اور تکیہ

صفوی دور کی ایک اہم ایجاد مستقل عزاداری مراکز تھے۔

اس سے پہلے زیادہ تر مجالس گھروں، مساجد یا علماء کے حلقوں میں ہوتی تھیں، لیکن اب مستقل عمارتیں تعمیر ہونے لگیں جنہیں بعد میں "تکیہ" اور "حسینیہ" کہا گیا۔

یہاں محرم کے پورے عشرے میں مسلسل مجالس، مرثیہ خوانی اور مقتل خوانی ہوتی تھی۔

یہ تبدیلی صرف مذہبی نہیں بلکہ سماجی بھی تھی، کیونکہ اس سے عزاداری خاندانوں سے نکل کر پورے معاشرے کی مشترکہ ثقافت بن گئی۔

منبر کا ارتقاء

اگرچہ منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے موجود تھا، لیکن صفوی دور میں عزاداری کے منبر نے نئی شکل اختیار کی۔

اب خطیب صرف حدیث بیان نہیں کرتا تھا بلکہ:

تاریخِ کربلا،

قرآن کی تفسیر،
اخلاقی نصیحت،
مرثیہ،
اور آخر میں مصائب پڑھتا تھا۔
یہی ترتیب آج بھی دنیا کے بیشتر شیعہ معاشروں میں رائج ہے۔

روضہ خوانی کی ابتدا

صفوی دور میں ایک نہایت اہم ادبی تبدیلی رونما ہوئی۔
حسین واعظ کاشفی (متوفی 910ھ) نے فارسی زبان میں روضۃ الشہداء تصنیف کی۔
یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ مجالس میں اسے باقاعدہ پڑھا جانے لگا۔
چونکہ اس کتاب کا نام "روضۃ الشہداء" تھا، اس لیے اسے پڑھنے والوں کو "روضہ خوان" کہا جانے لگا، اور یہی لفظ بعد میں پوری مجلس کے لیے استعمال ہونے لگا۔
یہاں ایک تحقیقی نکتہ ضروری ہے۔

بعض علماء، خصوصاً شہید مرتضیٰ مطہری، نے توجہ دلائی ہے کہ اس کتاب میں بعض ایسے تاریخی واقعات بھی شامل ہوگئے تھے جن کی مضبوط سند دستیاب نہیں تھی۔

اسی لیے انہوں نے تاکید کی کہ روضہ خوانی ضرور ہو، لیکن حتی الامکان مستند مآخذ سے ہو۔

حوالہ:

- حماسہ حسینی۔
- روضۃ الشھداء۔

تعزیہ اور شبیہ خوانی

صفوی دور میں عزاداری کی سب سے نمایاں نئی صورت تعزیہ یا شبیہ خوانی تھی۔

یہ ایک ڈرامائی انداز میں واقعۂ کربلا کی منظر کشی ہوتی تھی، جس میں مختلف افراد شہداء اور دیگر کرداروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

مورخین کی اکثریت کا رجحان یہ ہے کہ تعزیہ اپنی منظم شکل میں صفوی دور اور خصوصاً قاجار دور میں پروان چڑھا، اگرچہ اس کے بعض ابتدائی عناصر اس سے پہلے بھی مل سکتے ہیں۔

بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی، جبکہ بعض نے اس کے بعض پہلوؤں پر اعتراضات بھی کیے، خصوصاً اگر اس میں غیر مستند واقعات یا غیر مناسب حرکات شامل ہو جائیں۔

علم اور پرچم

صفوی دور میں علم کا استعمال نمایاں ہونے لگا۔

البتہ اس کی اصل ابتدا کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔

کچھ محققین اسے فوجی جھنڈوں کی علامت سے جوڑتے ہیں۔

بعض اسے حضرت عباسؑ کے علم کی علامتی یادگار قرار دیتے ہیں۔

لیکن اب تک کوئی ایسی معتبر پہلی یا دوسری صدی کی روایت موجود نہیں جس میں موجودہ شکل کے علم کا ذکر ملتا ہو۔

لہٰذا تاریخی طور پر محتاط بات یہی ہے کہ علم بطور موجودہ شعیرہ بعد کے ادوار میں تدریجاً وجود میں آیا۔

تحقیقی نتیجہ

صفوی دور عزاداری کی تاریخ کا وہ مرحلہ ہے جہاں اصل دینی بنیادوں پر قائم عزاداری نے ایک وسیع تہذیبی اور سماجی صورت اختیار کی۔ مجالس، روضہ خوانی، مستقل حسینیے، منظم جلوس، علم، تعزیہ اور دیگر کئی رسوم اسی دور میں یا اس کے بعد اپنی معروف شکل میں سامنے آئیں۔ تاہم ان میں سے اکثر کے بارے میں پہلی تین صدیوں کے حدیثی مصادر خاموش ہیں۔ اس لیے تاریخی اعتبار سے یہ کہنا درست نہیں کہ یہ تمام رسوم بعینہٖ ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ زیادہ درست تعبیر یہ ہے کہ یہ تاریخی ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عرفی صورتیں ہیں، جن کی شرعی حیثیت کا فیصلہ بعد میں فقہائے امامیہ نے "شعائر"، "عرف"، "اباحت" اور "مصالحِ دینیہ" جیسے اصولوں کی بنیاد پر کیا۔

اہم مراجع

- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔
- The Martyrs of Karbala۔
- An Introduction to Shi'i Islam۔

- روضۃ الشھداء۔
- حماسہ حسینی۔

باب ششم

برصغیر میں عزاداری کا ارتقاء: موجودہ اردو عزاداری کی تشکیل

اگر آج دنیا میں کسی خطے نے عزاداری کو ایک منفرد تہذیبی، ادبی اور سماجی رنگ دیا ہے تو وہ برصغیر ہے۔ ایران نے عزاداری کو ریاستی سرپرستی اور مذہبی تنظیم دی، عراق نے اسے زیارت اور حرمین کے ساتھ جوڑا، لیکن ہندوستان اور بعد میں پاکستان نے اسے ادب، فن، زبان، تعمیرات، موسیقیِ کلام (بغیر آلات)، مرثیہ، نوحہ، جلوس اور عوامی شرکت کے اعتبار سے ایک نئی جہت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کراچی، لاہور، لکھنؤ، حیدرآباد دکن اور دیگر شہروں کی عزاداری دنیا بھر میں اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔

لیکن ایک محقق کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام رسوم ابتدا ہی سے برصغیر میں موجود تھیں؟ تاریخ کا جواب نفی میں ہے۔ یہ بھی ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔

برصغیر میں تشیع کی آمد

برصغیر میں اہل بیتؑ سے محبت اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں پہنچ چکی تھی، لیکن باقاعدہ شیعہ سیاسی اور مذہبی مراکز چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ دکن کی بہمنی سلطنت، بعد ازاں قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے تشیع کی سرپرستی کی، جبکہ شمالی ہندوستان میں اودھ (خصوصاً لکھنؤ) نے اٹھارہویں صدی میں عزاداری کو غیر معمولی فروغ دیا۔

دکن کے گولکنڈہ اور بعد میں حیدرآباد میں محرم کی مجالس، علم اور جلوسوں کا اہتمام ہونے لگا، لیکن اس دور کی عزاداری آج کے مقابلے میں نسبتاً سادہ تھی۔

حوالہ:

- Shi'ism in South Asia۔
- An Introduction to Shi'i Islam۔

اودھ اور لکھنؤ: اردو عزاداری کا مرکز

اگر صفوی ایران نے عزاداری کو ریاستی سرپرستی دی تو اودھ کے نوابوں نے اسے ادبی عظمت عطا کی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں لکھنؤ صرف سیاسی دارالحکومت نہیں تھا بلکہ پوری شیعہ دنیا کا ایک اہم ثقافتی مرکز بن گیا۔ امام بارگاہیں تعمیر ہوئیں، بڑے بڑے جلوس منظم ہوئے، مجالس کا باقاعدہ نظام قائم ہوا اور سب سے بڑھ کر اردو مرثیہ اپنی معراج کو پہنچا۔

یہاں پہلی مرتبہ عزاداری صرف مذہبی عمل نہ رہی بلکہ ایک مکمل تہذیب کی شکل اختیار کر گئی۔

امام بارگاہ کا ارتقاء

اگرچہ حسینیہ اور تکیہ صفوی دور میں معروف ہو چکے تھے، لیکن برصغیر میں ان کی مقامی صورت "امام بارگاہ" کی شکل میں سامنے آئی۔

امام بارگاہ صرف مجلس کی جگہ نہیں تھی بلکہ:

- دینی تعلیم کا مرکز۔
- محرم کی تنظیم کا مرکز۔

- نیاز اور سبیل کا انتظام۔
- نوحہ خوانی کی محفل۔
- اور سماجی رابطے کا مقام بھی تھی۔

اسی دور میں بڑے امام بارگاہوں کی تعمیر شروع ہوئی۔
خصوصاً آصف الدولہ کی تعمیر کردہ بڑا امام باڑہ آج بھی برصغیر کی عزاداری کی عظیم علامتوں میں شمار ہوتی ہے۔

مرثیہ کی پیدائش

واقعۂ کربلا پر عربی اور فارسی شاعری پہلے سے موجود تھی، لیکن اردو مرثیہ نے جس بلندی کو حاصل کیا وہ دنیا کی ادبی تاریخ میں منفرد ہے۔
ابتدائی مرثیہ گو شعرا میں میر ضمیر، میر خلیق اور دوسرے شعراء شامل تھے، لیکن مرثیہ اپنے عروج پر دو عظیم شاعروں کے ہاتھوں پہنچا۔
میر انیس
اور
مرزا دبیر

ان دونوں نے نہ صرف کربلا کو شاعری کا موضوع بنایا بلکہ انسانی نفسیات، اخلاق، وفاداری، شجاعت، صبر، ایثار اور عدل کو بھی اپنے مراثی کا حصہ بنایا۔

میر انیس اور مرزا دبیر میں فرق

اگرچہ دونوں عظیم شاعر تھے، لیکن ان کا انداز مختلف تھا۔

میر انیس کی شاعری میں انسانی کردار، نفسیاتی کیفیت، مکالمہ، جذبات اور فصاحت زیادہ نمایاں ہے۔

مرزا دبیر کے ہاں منظر نگاری، الفاظ کی شان، صنعت گری اور عظمتِ بیان زیادہ نظر آتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر میں دونوں کا تفصیلی تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ دونوں نے اردو ادب کو غیر معمولی وسعت دی۔

نوحہ خوانی کا ارتقاء

ائمہؑ کے زمانے میں مرثیہ اور شعر ضرور تھے، لیکن آج کے منظم نوحے، مخصوص بحریں، اجتماعی جواب، سینہ زنی کے ساتھ ہم آہنگی، اور الگ نوحہ خوان طبقہ بعد کی صدیوں میں وجود میں آیا۔

برصغیر نے اس فن کو غیر معمولی ترقی دی۔
یہاں نوحہ صرف شعر نہیں رہا بلکہ ایک اجتماعی دینی اظہار بن گیا۔

ذوالجناح

برصغیر میں ذوالجناح کی روایت خاص طور پر مقبول ہوئی۔
تاریخی طور پر اس کی بنیاد یہ ہے کہ امام حسینؑ کا گھوڑا "ذوالجناح" میدانِ کربلا سے خیموں کی طرف واپس آیا۔
یہ واقعہ بعض مقتلوں میں مذکور ہے، لیکن اس کی تمام تفصیلات ہر قدیم ماخذ میں یکساں نہیں ملتیں۔
بعد کی صدیوں میں اسی تاریخی واقعے کی یاد میں علامتی گھوڑا جلوسوں میں شامل ہونے لگا۔
اب تک کوئی معتبر پہلی یا دوسری صدی کی روایت موجود نہیں جس میں موجودہ علامتی ذوالجناح کے جلوس کا ذکر ہو۔
لہٰذا یہ ایک تاریخی علامت (Historical Symbol) ہے، نہ کہ منصوص شرعی عبادت۔

علم

برصغیر میں علم حضرت عباسؑ کی وفاداری اور علمبرداری کی علامت کے طور پر رائج ہوا۔

علم کی موجودہ تزئینی شکل، چاند، پنجہ، کپڑا، دھات اور مختلف آرائش صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔

قدیم اسلامی مصادر میں اس موجودہ ہیئت کا ذکر نہیں ملتا۔

تعزیہ

برصغیر کی سب سے منفرد رسم "تعزیہ" ہے۔

یہ کربلا کے روضۂ مبارک یا شہداء کی قبور کی علامتی شبیہ ہوتی ہے۔

تعزیے کی روایت ایران سے متاثر ہو کر ہندوستان پہنچی، لیکن یہاں اس نے اپنی جداگانہ ثقافتی شکل اختیار کر لی۔

بعض فقہاء نے اسے محض علامتی یادگار سمجھا، جبکہ بعض نے اس میں مبالغہ یا غیر شرعی عقائد شامل ہونے پر تنقید کی۔

اسی لیے تعزیہ کے بارے میں فقہاء کا موقف ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا۔

سبیل

سبیل کی بنیاد نسبتاً واضح ہے۔

یہ حضرت عباسؑ اور کربلا میں پانی کی محرومی کی یاد سے متعلق ایک علامتی خدمت ہے۔

اگرچہ موجودہ سبیلوں کی تنظیم بعد میں ہوئی، لیکن پیاسوں کو پانی پلانا بذاتِ خود اسلامی تعلیمات کا مستقل حصہ ہے۔

اس لیے فقہاء نے عمومی طور پر اسے مستحب خدمت کے طور پر دیکھا، بشرطیکہ اس میں کوئی غیر شرعی امر شامل نہ ہو۔

کیا یہ سب رسوم ائمہؑ نے مقرر کی تھیں؟

یہ وہ سوال ہے جس پر جذبات سے زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے۔

اب تک کے تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ کہنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ:

اصل عزاداری، گریہ، مرثیہ، زیارت، ذکرِ مصائب اور اہل بیتؑ کی یاد ائمہؑ اہل بیتؑ کی تعلیمات سے ثابت ہے۔

لیکن علم، تعزیہ، ذوالجناح، موجودہ نوحہ خوانی، امام بارگاہوں کی موجودہ ہیئت، سبیلوں کی تنظیم، اور جلوسوں کی بہت سی عملی صورتیں مختلف ادوار میں تدریجاً وجود میں آئیں۔

یہ فرق سمجھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ اسی فرق کی بنیاد پر فقہائے امامیہ نے "اصلِ عبادت" اور "عرفی شعائر" کے درمیان امتیاز قائم کیا ہے۔

تحقیقی نتیجہ

برصغیر کی عزاداری درحقیقت چار بڑے عناصر کا حسین امتزاج ہے: اہل بیتؑ کی روایات، ایرانی صفوی اثرات، مقامی تہذیب، اور اردو ادب۔ اس امتزاج نے ایک ایسی مذہبی ثقافت کو جنم دیا جو دنیا کے کسی اور خطے میں اسی شکل میں موجود نہیں۔ اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کرنا نہ اس کی نفی ہے اور نہ اس کی تقدیس، بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ دین کی اصل اور اس کے ثقافتی اظہار میں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق آگے چل کر فقہی بحث کی بنیاد بنتا ہے۔

اہم مراجع

- Shi'ism in South Asia۔
- An Introduction to Shi'i Islam۔

- موازنۂ انیس و دبیر۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔
- حماسۂ حسینی۔

باب ہفتم

فقہائے جامع الشرائط نے بعد میں پیدا ہونے والی رسوم کو کس بنیاد پر جائز قرار دیا؟

گزشتہ ابواب میں ہم تاریخی سفر طے کر چکے ہیں۔ اب ہم اس تحقیق کے سب سے اہم مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ موجودہ عزاداری کی بہت سی صورتیں ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے میں موجود نہیں تھیں بلکہ بعد کی صدیوں میں تدریجاً وجود میں آئیں، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہائے امامیہ نے انہیں کس بنیاد پر قبول کیا؟ کیا انہوں نے ان رسوم کو دین کا حصہ قرار دیا؟ یا ان کے لیے کوئی الگ فقہی اصول اختیار کیا؟

یہاں ایک بنیادی غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے۔ عوام میں اکثر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ چونکہ کوئی رسم مراجعِ تقلید کے زمانے میں رائج ہے، اس لیے وہ لازماً معصومؑ کی مقرر کردہ سنت بھی ہو گی۔ جبکہ فقہِ جعفری میں یہ دونوں باتیں ایک نہیں ہیں۔ فقیہ کا کام کسی رسم کو "ایجاد" کرنا نہیں بلکہ اس کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے۔ اگر کوئی نیا سماجی طریقہ شریعت کے عمومی اصولوں سے

متصادم نہ ہو اور دین کی خدمت کا ذریعہ بن سکے تو فقیہ اس کے جواز یا استحباب کا فتویٰ دے سکتا ہے، لیکن اس سے وہ طریقہ توقیفی عبادت نہیں بن جاتا۔
یہ فرق پوری بحث کی بنیاد ہے۔

توقیفی عبادات اور عرفی شعائر میں فرق

فقہِ امامیہ عبادات کو دو بنیادی دائروں میں تقسیم کرتی ہے۔
پہلا دائرہ ان عبادات کا ہے جن کی کیفیت، مقدار، وقت اور طریقہ خود شارع نے مقرر کیا ہے۔ نماز کی رکعات، روزے کا وقت، حج کے مناسک اور زکوٰۃ کے نصاب اسی قسم میں آتے ہیں۔ ان میں کسی انسان کو کمی بیشی کا اختیار نہیں۔
فقہ کی اصطلاح میں اسے "توقیفی عبادات "کہا جاتا ہے۔
شیخ انصاری لکھتے ہیں کہ عبادات میں اصل یہ ہے کہ ان کی مشروعیت صرف شرعی دلیل سے ثابت ہو گی، محض عقل یا عرف سے نہیں۔
حوالہ:
فرائد الأصول۔

اس کے برعکس دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں شریعت نے مقصد تو بیان کیا ہے لیکن اس کے حصول کے ذرائع کو عرف پر چھوڑ دیا ہے۔

مثلاً:

دعوتِ دین واجب ہے۔

لیکن مائیکروفون، کتاب، انٹرنیٹ یا ٹیلی ویژن استعمال کرنا خود شارع نے مقرر نہیں کیا۔

اسی طرح قرآن کی تعلیم مطلوب ہے۔

لیکن چھاپہ خانہ، موبائل ایپ، یا ڈیجیٹل قرآن کسی روایت میں موجود نہیں۔

یہ سب وسائل ہیں، عبادات نہیں۔

فقہاء نے عزاداری کی بہت سی موجودہ صورتوں کو بھی اسی دوسرے دائرے میں رکھا۔

"شعائر" کا قرآنی اصول

فقہائے امامیہ کی سب سے اہم دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾

"اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔"

(سورۂ حج، آیت 32)

اصل سیاق میں یہاں شعائر سے مراد مناسکِ حج ہیں، لیکن فقہاء نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا "شعائر" صرف انہی تک محدود ہیں یا ہر وہ چیز جو دین کی علامت بن جائے، اس عمومی مفہوم میں آسکتی ہے؟

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں کہ "شعائر" ہر اس علامت کو کہا جاسکتا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد اور اس کی اطاعت کی طرف متوجہ کرے، اگرچہ ہر مصداق کا تعین اس کے اپنے دلائل سے ہو گا۔

حوالہ: المیزان فی تفسیر القرآن، سورۂ حج، آیت 32۔

اسی اصول کی بنیاد پر بعد کے فقہاء نے کہا کہ اگر عزاداری کی کوئی صورت لوگوں کو امام حسینؑ کی قربانی، دین کی بقا اور ظلم کے خلاف قیام کی یاد دلاتی ہے تو وہ شعائرِ حسینی کے عنوان سے قابلِ بحث ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ ہر رائج رسم خود بخود شعیرہ نہیں بن جاتی۔ کسی عمل کو شعیرہ قرار دینے کے لیے یہ دیکھنا ہو گا کہ آیا وہ واقعی دین کی علامت بن چکا ہے، اور کیا وہ شریعت کے کسی قطعی حکم سے متصادم تو نہیں۔

"احیائے امرِ اہل بیتؑ" کا اصول

فقہائے امامیہ کی دوسری بڑی دلیل وہ روایات ہیں جن میں ائمۂ اہل بیتؑ نے اپنے "امر" کو زندہ رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

» رَحِمَ اللّٰہُ عَبْدًا اَحْیَا اَمْرَنَا «

"اللہ اس بندے پر رحمت کرے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔"

جب راوی نے پوچھا کہ ہمارے امر کو کیسے زندہ کیا جائے؟

امامؑ نے فرمایا:

"ہماری احادیث سیکھو، دوسروں کو سکھاؤ، کیونکہ اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبصورتی کو جان لیں تو ہماری پیروی کریں گے۔"

حوالہ:

الأمالی؛

وسائل الشیعۃ، ج27۔

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ اہل بیتؑ کی تعلیمات کو زندہ رکھنا مطلوب ہے، لیکن اس کے ذرائع ہر زمانے میں یکساں ہونا ضروری نہیں۔

"اصلِ اباحت" کا فقہی قاعدہ

شیعہ فقہ کا ایک مشہور اصول ہے:

الأصل فی الأشیاء الإباحة

یعنی اشیاء اور عرفی معاملات میں اصل جواز ہے، جب تک حرمت پر کوئی دلیل نہ ہو۔

شیخ انصاری اور آخوند خراسانی دونوں نے اصولِ فقہ میں اس قاعدے کی تفصیل بیان کی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیا سماجی طریقہ:

- حرام پر مشتمل نہ ہو،
- کسی واجب کو ترک نہ کراتا ہو،
- اور دین کی خدمت کا ذریعہ بن سکتا ہو،

تو وہ ابتدائی طور پر مباح ہو گا، جب تک اس کی ممانعت پر کوئی خاص دلیل نہ ملے۔

اسی اصول کے تحت بعد کے فقہاء نے مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر، طباعت، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور آج انٹرنیٹ کے ذریعے تبلیغ کو بھی جائز قرار دیا۔

اسی قاعدے کا اطلاق بعض فقہاء نے عزاداری کی نئی صورتوں پر بھی کیا۔

"عنوانِ ثانوی" کی اہمیت

یہاں ایک نہایت اہم فقہی اصول سامنے آتا ہے جسے نظر انداز کرنے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

کسی عمل کا حکم ہمیشہ مستقل نہیں رہتا۔

کبھی ایک جائز عمل حالات کی وجہ سے ناجائز ہو سکتا ہے۔

اور کبھی ایک مباح عمل اہم مصلحت کی وجہ سے مستحب بن سکتا ہے۔

اسے فقہ میں عنوانِ ثانوی کہا جاتا ہے۔

مثلاً:

اگر کوئی عزاداری کی رسم اصل میں جائز ہو لیکن:

- اس سے لوگوں کی جان کو شدید خطرہ ہو،
- اسلام کی بدنامی ہو،
- فرقہ وارانہ فساد پیدا ہو،
- یا شریعت کے کسی قطعی حکم کی خلاف ورزی ہو،

تو فقیہ عنوانِ ثانوی کی بنیاد پر اس سے منع کر سکتا ہے۔

اسی لیے معاصر مراجع کے بعض فتاویٰ میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف اصلِ عزاداری میں نہیں بلکہ موضوع کی تشخیص میں ہے۔

کیا فقہاء نے تمام رسوم کو مستحب قرار دیا؟

یہ بھی ایک عام غلط فہمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے امامیہ نے عموماً اصلِ عزاداری کو مستحب اور شعائرِ حسینی میں شمار کیا ہے، لیکن ہر انفرادی رسم کو یکساں درجہ نہیں دیا۔

مثلاً کسی عمل کے بارے میں فقیہ یہ کہہ سکتا ہے:

- یہ مباح ہے۔
- یہ مستحب ہے۔
- یہ جائز ہے بشرطیکہ مفسدہ نہ ہو۔
- یہ جائز نہیں اگر اس سے دین کی توہین ہو۔
- یا اس کی کوئی شرعی بنیاد ثابت نہیں۔

اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ "فقہاء نے ہر رائج رسم کو سنت قرار دیا ہے۔"

تحقیقی نتیجہ

اس باب سے ایک نہایت اہم اصول سامنے آتا ہے۔ فقہائے جامع الشرائط نے عزاداری کی بعد میں پیدا ہونے والی صورتوں کو اس بنیاد پر قبول نہیں کیا کہ وہ ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے میں موجود تھیں، بلکہ اس بنیاد پر کہ وہ شریعت کے عمومی قواعد، شعائرِ الٰہی، احیائے امرِ اہل بیتؑ، اصلِ اباحت اور عرفِ متشرعہ کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ کوئی بھی رسم اگر حرام، غلو، خرافات، جھوٹ، یا اسلام کی بدنامی کا سبب بنے تو وہ انہی اصولوں کی بنا پر قابلِ ترک بھی ہو سکتی ہے۔ یہی توازن فقہِ امامیہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اہم مراجع

- فرائد الأصول۔
- کفایۃ الأصول۔
- المیزان فی تفسیر القرآن۔
- الأمالی۔
- وسائل الشیعۃ۔

باب ہشتم

فقہائے امامیہ کی آراء: کیا موجودہ عزاداری کی تمام صورتوں کی تائید کی گئی ہے؟

گزشتہ باب میں ہم نے یہ اصولی بحث کی کہ فقہائے امامیہ نے بعد میں پیدا ہونے والی رسوم کو کن فقہی اصولوں کی بنیاد پر پرکھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہم شیخ انصاری سے لے کر عصر حاضر کے مراجعِ تقلید تک آتے ہیں تو کیا ان سب کی رائے ایک جیسی ہے؟ کیا ہر فقیہ نے تمام موجودہ رسوم کو یکساں طور پر مستحب قرار دیا ہے؟ یا ان کے درمیان بعض امور میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب نہ "ہاں" میں ہے اور نہ "نہیں" میں، بلکہ حقیقت اس سے زیادہ دقیق ہے۔ اگر مجموعی تصویر دیکھی جائے تو تقریباً تمام بڑے فقہائے امامیہ چند بنیادی اصولوں پر متفق ہیں، لیکن بعض رسوم کے اطلاق اور ان کے مصادیق میں اختلافِ نظر رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ فقہائے امامیہ نے اصلِ عزاداری، ذکرِ مصائب، مجالسِ حسینی، مرثیہ خوانی، گریہ اور زیارتِ امام حسینؑ کو مستحب اور

شعائرِ دینیہ میں شمار کیا ہے۔ اختلاف وہاں شروع ہوتا ہے جہاں کسی نئی رسم کی شرعی حیثیت یا اس کے سماجی اثرات زیرِ بحث آتے ہیں۔

شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی 1281ھ)

شیخ انصاری کو جدید فقہِ امامیہ کا معمار کہا جاتا ہے۔ ان کی کتابیں المکاسب اور فرائد الأصول آج بھی حوزاتِ علمیہ میں بنیادی نصاب کا حصہ ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شیخ انصاری نے عزاداری کی مختلف رسوم پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، کیونکہ ان کے زمانے میں یہ مسئلہ آج کی طرح محلِ نزاع نہیں تھا۔ تاہم ان کے اصولِ فقہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ہر نئے عمل کو اس کے شرعی عنوان کے تحت پرکھتے تھے۔ اگر کوئی عرفی عمل شریعت سے متصادم نہ ہو تو وہ اصولِ اباحت کے تحت جائز ہو سکتا ہے، اور اگر وہ دین کی ترویج کا ذریعہ بنے تو ثانوی عنوانات کے تحت اس کی قدر بھی بڑھ سکتی ہے۔

لہٰذا شیخ انصاری کی نسبت سے یہ کہنا درست نہیں کہ انہوں نے ہر موجودہ رسم کی خصوصی تائید کی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے فقہی اصول بعد کے فقہاء کے لیے بنیاد بنے۔

میرزائے نائینی (متوفی 1355ھ)

عزاداری کے جدید فقہی مباحث میں سب سے زیادہ اہم نام میرزا محمد حسین نائینی کا ہے۔

انہوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب بعض حلقے عزاداری کی مختلف رسوم کو بدعت قرار دے رہے تھے۔ میرزا نائینی نے ایک مختصر مگر مؤثر رسالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا کہ اگر کوئی رسم:

امام حسینؑ کی یاد کو زندہ رکھتی ہو،

دین کی تبلیغ کا ذریعہ ہو،

اور شریعت کے خلاف نہ ہو،

تو اسے صرف اس بنیاد پر بدعت نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پہلے زمانے میں موجود نہیں تھی۔

البتہ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ جھوٹ، خرافات، غیر مستند واقعات اور ایسے اعمال جو دین کی توہین کا سبب بنیں، ان کی تائید نہیں کی جاسکتی۔

یہ توازن ان کے پورے موقف کی روح ہے۔

سید محسن امین عاملی (متوفی 1371ھ)

یہاں پہلی مرتبہ فقہائے امامیہ کے درمیان ایک نمایاں اختلاف سامنے آتا ہے۔

سید محسن امین نے اپنی معروف کتاب التنزیہ لأعمال الشبیہ میں بعض رائج رسوم، خصوصاً خود کو شدید زخمی کرنے والی صورتوں، بعض تعزیوں اور غیر مستند شبیہ خوانی پر تنقید کی۔

انہوں نے لکھا کہ ایسی چیزیں اگر اسلام کی بدنامی یا اہل بیتؑ کے پیغام کے بگڑنے کا سبب بنیں تو ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ان کی اس کتاب پر اس زمانے میں شدید علمی بحث ہوئی، لیکن آج تقریباً تمام معاصر فقہاء اس اصول سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلام کی توہین یا ضرر کا باعث بننے والے اعمال قابلِ قبول نہیں۔

امام خمینیؒ

روح اللہ خمینی نے عزاداری کو اسلامی انقلاب کی روح قرار دیا۔

ان کا مشہور جملہ ہے:

"یہ محرم اور صفر ہی ہیں جنہوں نے اسلام کو زندہ رکھا ہے۔"

لیکن اس جملے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر رسم بلا شرط درست ہے۔
امام خمینی نے متعدد مواقع پر تاکید کی کہ عزاداری کا اصل مقصد امام حسینؑ کے قیام کا پیغام زندہ رکھنا ہے۔
اگر کوئی رسم اس مقصد کے خلاف چلی جائے تو اس پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔
انہوں نے مجالس، جلوس، نوحہ اور ماتم کی حمایت کی، لیکن ساتھ ہی دین کی عزت اور معاشرے کی مصلحت کو بھی اہم قرار دیا۔

آیت اللہ سید ابو القاسم خوئیؒ

ابو القاسم خوئی کے فتاویٰ میں اصل معیار یہ ہے کہ جب تک کسی عمل کی حرمت پر دلیل نہ ہو، وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں قابلِ توجہ ضرر یا کوئی حرام امر شامل نہ ہو۔
اسی بنیاد پر ان کے بعض فتاویٰ میں بعض رسوم کی اجازت ملتی ہے، لیکن یہ اجازت مطلق نہیں بلکہ فقہی قیود کے ساتھ ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای

معاصر فقہاء میں سید علی خامنہ ای نے شعائرِ حسینی کے بارے میں نسبتاً تفصیلی رہنمائی دی ہے۔

انہوں نے بارہا فرمایا ہے کہ:

- مجالسِ عزا اسلامی معاشرے کی عظیم نعمت ہیں۔
- جلوس اور عزاداری کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔
- لیکن ہر ایسا عمل جس سے دشمن اسلام کی توہین کرے یا مذہب کی ساکھ متاثر ہو، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنیاد پر انہوں نے بعض صورتوں میں قمہ زنی کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ حالات میں یہ اسلام کی بدنامی کا سبب بنتی ہے۔

یہ فتویٰ "عنوانِ ثانوی" کے اصول پر مبنی ہے۔

آیت اللہ سید علی سیستانی

علی الحسینی السیستانی کی آراء میں بھی یہی توازن نظر آتا ہے۔

وہ عزاداری، مجالس، جلوس، نوحہ اور شعائرِ حسینی کی بھرپور حمایت کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ:

- عزاداری میں جھوٹے واقعات بیان نہ کیے جائیں۔
- غیر شرعی امور شامل نہ ہوں۔
- دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوں۔
- اسلام کی توہین کا سبب نہ بنے۔

ان کے استفتاءات میں بارہا یہ اصول دہرایا گیا ہے کہ ہر عمل کو اس کے شرعی عنوان کے مطابق دیکھا جائے گا، نہ کہ صرف رواج کی بنیاد پر۔

آیت اللہ وحید خراسانی

حسین وحید خراسانی شعائرِ حسینی کی عظمت پر بہت زور دیتے ہیں اور مجالس و عزاداری کی غیر معمولی اہمیت بیان کرتے ہیں۔

تاہم وہ بھی فقہی حدود کے پابند ہیں اور کسی عمل کو صرف جذبات کی بنیاد پر دین کا لازمی حصہ قرار نہیں دیتے۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

ناصر مکارم شیرازی نے اپنی متعدد فقہی تحریروں میں لکھا ہے کہ عزاداری کا مقصد امام حسینؑ کے اہداف کو زندہ رکھنا ہے۔

انہوں نے واضح کیا کہ:

اگر کوئی رسم اسلام کی عزت میں اضافہ کرے تو قابلِ احترام ہے۔

اور اگر کسی زمانے میں وہی رسم اسلام کی بدنامی کا ذریعہ بن جائے تو اس پر نظر ثانی ضروری ہو گی۔

یہ بھی عنوانِ ثانوی ہی کا اطلاق ہے۔

کیا تمام فقہاء متفق ہیں؟

اگر پورے منظرنامے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف اصل عزاداری میں نہیں بلکہ بعض جزوی رسوم کے بارے میں ہے۔

تقریباً تمام بڑے مراجع درج ذیل امور پر متفق ہیں:

- امام حسینؑ کی عزاداری مستحب اور شعائرِ دینیہ میں سے ہے۔
- مجالسِ عزا اور ذکرِ مصائب مشروع ہیں۔
- مرثیہ، نوحہ اور گریہ مستحب ہیں۔

- زیارتِ امام حسینؑ عظیم عبادت ہے۔
- عزاداری کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔

اختلاف ان امور میں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی رسم کے بارے میں یہ سوال اٹھے کہ آیا وہ واقعی شعیرہ ہے یا نہیں، یا موجودہ حالات میں اس کے نتائج کیا ہیں۔

تحقیقی نتیجہ

فقہائے جامع الشرائط کی مجموعی آراء کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے عزاداری کو کبھی جامد اور غیر متحرک عمل نہیں سمجھا، بلکہ اسے شریعت کے عمومی اصولوں کے تحت ایک زندہ مذہبی روایت کے طور پر دیکھا۔ انہوں نے نہ ہر نئی رسم کو بلا دلیل قبول کیا اور نہ ہر نئی صورت کو بدعت قرار دیا۔ ان کا معیار ہمیشہ قرآن، سنت، فقہی قواعد، عرفِ متشرعہ، مصلحتِ اسلام اور شعائرِ حسینی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض رسوم پر اختلاف ہونے کے باوجود اصل عزاداری کے بارے میں فقہائے امامیہ کے درمیان ایک نمایاں اتفاق پایا جاتا ہے۔

اہم مراجع

- المکاسب۔
- فرائد الأصول۔
- التنزیہ لأعمال الشبیہ۔
- استفتاءات اور فقہی آراء: روح اللہ خمینی، ابوالقاسم خوئی، سید علی خامنہ ای، علی الحسینی السیستانی، حسین وحید خراسانی، ناصر مکارم شیرازی۔

باب نہم

پہلی محرم سے ۹ ربیع الاول تک: موجودہ ایامِ عزا کی تاریخی بنیاد کیا ہے؟

گزشتہ ابواب میں ہم نے عزاداری کے ارتقاء اور اس کے فقہی اصولوں کا مطالعہ کیا۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جو تقریباً ہر شیعہ کے ذہن میں کبھی نہ کبھی ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جب محرم کا چاند نظر آتا ہے تو پورے شیعہ معاشرے میں غم کا ایک مخصوص دور شروع ہو جاتا ہے، جو بعض علاقوں میں عاشورا تک، بعض میں اربعین تک، بعض میں ۲۸ صفر تک اور بہت سے علاقوں میں ۸ ربیع الاول بلکہ ۹ ربیع الاول تک جاری رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان مختلف ادوار کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ سب ائمۂ اہل بیتؑ نے مقرر کیے تھے، یا یہ تاریخ کے مختلف مراحل میں تشکیل پانے والی مذہبی روایت ہے؟

اس باب میں ہم جذبات کے بجائے تاریخ اور فقہ کی روشنی میں ہر مرحلے کا جائزہ لیں گے۔

محرم کا آغاز: پہلی محرم

آج پوری شیعہ دنیا میں پہلی محرم سے سیاہ لباس پہننا، مجالس کا آغاز، گھروں اور امام بارگاہوں میں سیاہ پرچم لگانا اور شادی بیاہ جیسی تقریبات سے اجتناب عام ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پہلی صدی ہجری کی روایات میں "پہلی محرم" کے حوالے سے کسی خاص مجلس یا مخصوص رسم کا ذکر نہیں ملتا۔

البتہ امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں امام رضاؑ کی روایت موجود ہے کہ:

"جب محرم آتا تو میرے والد پر غم غالب ہو جاتا اور عاشورا تک آپ کو مسکراتے نہیں دیکھا جاتا تھا۔"

حوالہ:

عیون أخبار الرضا، ج2۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم دوسری صدی ہجری میں اہل بیتؑ کے گھرانے میں محرم کے آغاز سے غم کا ماحول موجود تھا۔

البتہ موجودہ دس روزہ منظم مجالس بعد کے ارتقاء کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

یکم سے نو محرم

پہلی تین صدیوں کے معتبر مصادر میں روزانہ کی مخصوص مجالس کا ذکر نہیں ملتا۔

تاریخی طور پر محرم کی پہلی دہائی کی روزانہ مجالس خصوصاً صفوی دور اور پھر برصغیر میں بہت زیادہ منظم ہوئیں۔

اس سے پہلے بھی مجالس ہوتی تھیں، لیکن موجودہ ترتیب بعد کی پیداوار ہے۔

سات محرم

برصغیر میں سات محرم کو حضرت عباسؑ سے منسوب کرنا اور "پانی بند ہونے" کی یاد منانا عام ہے۔

یہاں ایک تحقیقی نکتہ ضروری ہے۔

قدیم مقتلوں میں فرات کا پانی بند کیے جانے کا ذکر ضرور ہے، لیکن پانی سات محرم کو بند ہوا، اس کی تاریخ تمام قدیم مصادر میں یکساں نہیں۔

مثلاً:

- تاریخ الرسل والملوک۔

- الإرشاد۔
- اللہوف۔

ان میں اصل واقعہ مذکور ہے، لیکن سات محرم کی تعیین کے بارے میں بعد کے مقتل نگاروں میں زیادہ وضاحت ملتی ہے۔

لہٰذا تاریخی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اصل واقعہ قطعی ہے، لیکن سات محرم کی تعیین تمام قدیم مصادر میں یکساں مضبوط نہیں۔

آٹھ محرم

آٹھ محرم کے ساتھ بعض مقامات پر حضرت علی اکبرؑ یا حضرت قاسمؑ کی مخصوص مجالس منسلک کر دی گئی ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اس تقسیم کی کوئی قدیم روایت نہیں ملتی۔

یہ تقسیم زیادہ تر ذاکروں اور مجالس کی سہولت کے لیے بعد میں رائج ہوئی۔

نو محرم (تاسوعا)

نو محرم کی تاریخی بنیاد مضبوط ہے۔

قرآن نہیں بلکہ متعدد تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دن حضرت عباسؑ دشمن کے لشکر سے مہلت لینے گئے تھے تاکہ شبِ عاشور عبادت میں گزاری جاسکے۔

امام حسینؑ نے فرمایا:

"اللہ جانتا ہے کہ میں نماز، قرآن اور دعا کو پسند کرتا ہوں۔"

حوالہ:

- الإرشاد۔
- تاریخ الطبری۔
- اللہوف۔

اسی لیے تاسوعا کی عزاداری کی تاریخی بنیاد کافی مضبوط سمجھی جاتی ہے۔

عاشورا(10 محرم)

یہ پوری عزاداری کا مرکز ہے۔

اس دن کی عزاداری، گریہ، زیارت، دعا اور مصائب اہل بیتؑ کی روایات سے ثابت ہیں۔

امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے عاشورا کے اعمال متعدد معتبر روایات میں منقول ہیں۔

حوالہ:

- کامل الزیارات۔
- مصباح المتہجد۔

یہ وہ دن ہے جس کی شرعی حیثیت تمام شیعہ فقہاء کے نزدیک مسلم ہے۔

گیارہ محرم

گیارہ محرم اسراء کے سفر کا آغاز ہے۔

قدیم مقتلوں میں اس دن خیموں کی تباہی، اسراء کی روانگی اور شہداء کی لاشوں کے میدان میں رہ جانے کا ذکر ملتا ہے۔

البتہ گیارہ محرم کی مستقل مجلس بعد کے ادوار میں زیادہ منظم ہوئی۔

شامِ غریباں

آج شامِ غریباں تقریباً پوری شیعہ دنیا میں منائی جاتی ہے۔

لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی موجودہ اجتماعی صورت پہلی تین صدیوں میں نہیں ملتی۔

اصل واقعہ یعنی:

- خیموں کا جلنا۔
- بچوں کی آہ وبکا۔
- حضرت زینبؑ کی مصیبت۔

یہ سب تاریخی طور پر ثابت ہیں۔

لیکن شمعیں بجھا کر مخصوص انداز میں مجلس منعقد کرنا بعد کے ادوار کی مذہبی روایت معلوم ہوتی ہے۔

بارہ محرم

برصغیر میں بارہ محرم کے جلوس عام ہیں۔

قدیم مصادر میں بارہ محرم کی مستقل مذہبی حیثیت بیان نہیں ہوئی۔

یہ زیادہ تر مقامی تاریخی ارتقاء کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

تحقیقی نتیجہ

پہلی سے بارہ محرم تک کے ایام کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اصل واقعات، جیسے محرم میں غم، تاسوعا، عاشورا، شہادت، اسراء اور اہل بیتؑ کے مصائب، مضبوط تاریخی بنیاد رکھتے ہیں۔ تاہم ہر دن کے ساتھ منسلک موجودہ مجالس، مخصوص شخصیات کی تقسیم، جلوسوں کی ترتیب اور بعض رسوم تاریخی ارتقاء کا نتیجہ ہیں، نہ کہ ان سب کی تفصیل پہلی صدی ہجری سے منقول ہے۔

اس فرق کو سمجھنا علمی دیانت کا تقاضا ہے، کیونکہ یہی فرق ہمیں اصل دینی نصوص اور بعد کے مذہبی و ثقافتی اظہار میں امتیاز سکھاتا ہے۔

اہم مراجع

- تاریخ الرسل والملوک۔
- الإرشاد۔
- اللہوف۔
- کامل الزیارات۔
- مصباح المتہجد۔
- عیون أخبار الرضا۔

باب دہم

اربعین، ۲۸ صفر، ۸ ربیع الاول اور ۹ ربیع الاول: کیا ۹ ربیع الاول تک ایامِ عزا منانے کی شرعی و تاریخی بنیاد موجود ہے؟

گزشتہ باب میں ہم نے محرم کے پہلے عشرے اور اس کے بعد کے ابتدائی ایام کا تاریخی جائزہ لیا۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جس پر آج شیعہ دنیا میں مختلف عملی روایات پائی جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں عزاداری صرف عاشوراتک محدود رہتی ہے، بعض میں گیارہ یا بارہ محرم تک، بعض میں اربعین تک، بعض میں ۲۸ صفر تک، جبکہ ایران، عراق، پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں غم کا ماحول ۸ ربیع الاول تک برقرار رکھا جاتا ہے اور ۹ ربیع الاول کو ایک نئے مرحلے کے آغاز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام مراحل کی بنیاد براہِ راست ائمۂ اہل بیتؑ کی تعلیمات میں موجود ہے، یا یہ مختلف تاریخی ادوار میں تشکیل پانے والی مذہبی روایت ہے؟

اربعین (۲۰ صفر)

اگر عاشورا کے بعد کسی دن کی شرعی بنیاد سب سے زیادہ مضبوط ہے تو وہ ۲۰ صفر (اربعین) ہے۔

اس کی پہلی دلیل امام حسن عسکریؑ کی مشہور روایت ہے:

» علامات المؤمن خمس « ...

"مؤمن کی پانچ نشانیاں ہیں... ان میں سے ایک زیارتِ اربعین ہے۔"

حوالہ:

- تھذیب الأحکام، ج6۔
- مصباح المتھجد۔

یہ روایت شیعہ حدیثی ذخیرے میں اربعین کی اہم ترین بنیاد ہے۔

کیا اسراء اربعین کے دن کربلا واپس آئے تھے؟

یہاں ایک تاریخی اختلاف موجود ہے۔

مشہور عوامی روایت یہ ہے کہ ۲۰ صفر کو اہل بیتؑ شام سے واپس آکر کربلا پہنچے اور حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے ملاقات ہوئی۔

لیکن جب قدیم تاریخی مصادر کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر اتفاق نہیں۔

مثلاً:

تاریخ الطبری میں اس واپسی کا ذکر نہیں۔

الکامل فی التاریخ بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔

البتہ سید ابن طاؤوس نے اللہوف میں اس احتمال کو ذکر کیا ہے، اگرچہ اپنی دوسری کتاب اِقبال الأعمال میں خود اس پر تردد بھی ظاہر کیا ہے۔

بعد کے محققین میں اس مسئلے پر مختلف آراء سامنے آئیں۔

علامہ محدث نوری نے اس واپسی کو تاریخی لحاظ سے مشکل قرار دیا، جبکہ سید عبد الرزاق مقرم اور بعض دیگر علماء نے اس کی تائید کی۔

معاصر محقق رسول جعفریان بھی اس اختلاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اس لیے علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ کہا جائے:

زیارتِ اربعین کی شرعی بنیاد مضبوط ہے، لیکن اسراء کے ۲۰ صفر کو کربلا پہنچنے کا مسئلہ تاریخی اختلاف کا حامل ہے۔

جابر بن عبد اللہ انصاری کی زیارت

تقریباً تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ اولین زائرانِ امام حسینؑ میں شمار ہوتے ہیں۔

عطیہ عوفی کے ساتھ ان کی زیارت کا واقعہ متعدد قدیم مصادر میں مذکور ہے۔

یہ واقعہ اربعین کی تاریخی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

حوالہ:

- بشارۃ المصطفی۔
- مصباح المتہجد۔

کیا عاشورا سے اربعین تک مسلسل عزاداری ائمہؑ سے ثابت ہے؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔

قدیم روایات میں ہمیں عاشورا، زیارتِ عاشورا، گریہ، مرثیہ اور اربعین کی زیارت تو ملتی ہے، لیکن عاشورا سے اربعین تک مسلسل روزانہ مجالس کے انعقاد کی کوئی صریح روایت نہیں ملتی۔

یہ عمل بعد کے شیعہ معاشروں میں تدریجاً منظم ہوا، خصوصاً صفوی دور اور پھر عراق و ایران میں جدید دور میں۔

لہٰذا:

اصل اربعین شرعی روایت ہے، لیکن عاشورا سے اربعین تک مسلسل موجودہ طرز کی عزاداری تاریخی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

۲۸ صفر

برصغیر، ایران اور عراق میں ۲۸ صفر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام حسن مجتبیٰؑ کی شہادت کے عنوان سے عزاداری کی جاتی ہے۔

یہاں دو الگ مسائل ہیں۔

پہلا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ وفات۔

دوسرا:

امام حسنؑ کی تاریخِ شہادت۔

دونوں میں تاریخی اختلاف موجود ہے۔

رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بارے میں ۲۸ صفر، ۱۲ ربیع الاول اور بعض دیگر اقوال بھی ملتے ہیں۔

اسی طرح امام حسنؑ کی شہادت کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں، اگرچہ شیعہ روایت میں ۲۸ صفر زیادہ معروف ہے۔

لہٰذا ۲۸ صفر کی عزاداری شیعہ مذہبی روایت میں مضبوط حیثیت رکھتی ہے، لیکن تمام مؤرخین اس تاریخ پر متفق نہیں۔

صفر کے پورے مہینے میں غم

آج بہت سے شیعہ معاشروں میں محرم کے ساتھ صفر کو بھی مکمل غم کا مہینہ سمجھا جاتا ہے۔

قدیم حدیثی مصادر میں صفر کے پورے مہینے کو مسلسل ایامِ عزا قرار دینے کی کوئی واضح روایت موجود نہیں۔

البتہ چونکہ اس مہینے میں:

- اربعین۔
- رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات (شیعہ روایت کے مطابق)۔

- امام حسنؑ کی شہادت۔
- امام رضاؑ کی شہادت۔

واقع ہوئی، اس لیے رفتہ رفتہ صفر بھی غم کے مہینے کی صورت اختیار کرتا گیا۔
یہ زیادہ تر تاریخی اور مذہبی ارتقاء کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

۸ ربیع الاول

۸ ربیع الاول امام حسن عسکریؑ کی شہادت کا دن ہے۔
اس کی بنیاد شیعہ تاریخی مصادر میں موجود ہے۔
اسی وجہ سے اس دن عزاداری کی جاتی ہے۔
یہ شیعہ تقویم کا ایک مستند حصہ ہے۔

۹ ربیع الاول

یہ پورے موضوع کا سب سے حساس حصہ ہے۔
آج بہت سے علاقوں میں ۹ ربیع الاول کو:

- عیدِ زہراؑ۔
- آغازِ امامتِ امام مہدیؑ۔

- خوشی کا دن۔

سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اس موضوع میں مختلف روایات آپس میں خلط ملط ہو گئی ہیں۔

تاریخی طور پر دو الگ حقیقتیں ہیں۔

پہلی:

۹ ربیع الاول امام زمانہؑ کی امامت کے آغاز کا دن ہے۔

یہ شیعہ عقیدے کے مطابق درست ہے، کیونکہ امام حسن عسکریؑ کی شہادت ۸ ربیع الاول کو ہوئی۔

دوسری:

اس دن سے منسوب بعض عوامی روایات، جن میں بعض مخصوص تاریخی شخصیات کے قتل یا دیگر واقعات کو اس تاریخ سے جوڑا جاتا ہے، قدیم معتبر حدیثی مصادر میں مضبوط سند کے ساتھ ثابت نہیں۔

علامہ مجلسی نے بعض ایسی روایات بحار الأنوار میں نقل کی ہیں، لیکن خود انہوں نے ہر روایت کو صحیح قرار نہیں دیا۔ بحار الأنوار ایک جامع مجموعۂ روایات ہے، نہ کہ صرف صحیح احادیث کا مجموعہ۔

اسی طرح مسار الشیعۃ کی بعض نسبتوں اور اس سے متعلق روایات پر بھی محققین نے بحث کی ہے۔

معاصر علماء، مثلاً رسول جعفریان، جعفر مرتضیٰ عاملی اور دیگر محققین نے اس موضوع پر مزید تنقیدی تحقیق کی ہے اور بعض مشہور عوامی روایات کو تاریخی طور پر غیر ثابت قرار دیا ہے۔

کیا ۹ ربیع الاول تک مسلسل ایامِ عزا ائمہؑ نے مقرر کیے؟

اب اس پورے باب کا مرکزی سوال سامنے آتا ہے۔

جب پہلی تین صدیوں کی روایات اور تاریخی مصادر کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ:

- عاشورا کی عزاداری ثابت ہے۔
- اربعین کی زیارت ثابت ہے۔
- امام حسنؑ، امام رضاؑ اور امام حسن عسکریؑ کی شہادتوں کی یاد ثابت ہے۔

لیکن محرم کی پہلی تاریخ سے ۸ ربیع الاول تک مسلسل ایک ہی "دورِ عزا" منانے کا کوئی صریح حکم یا نص ائمۂ اہل بیتؑ سے موجود نہیں ملتی۔

یہ روایت وقت کے ساتھ شیعہ مذہبی ثقافت میں تشکیل پائی، خصوصاً جب محرم، صفر اور ۸ ربیع الاول کے واقعات کو ایک مسلسل روحانی سلسلے کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

اس لیے علمی طور پر زیادہ درست تعبیر یہ ہو گی کہ:

یہ ایک معتبر شیعہ مذہبی روایت (Religious Tradition) ہے، لیکن اسے ائمہؑ کی طرف بطور منصوص اور مقررہ شرعی مدت منسوب کرنا تاریخی شواہد سے ثابت نہیں۔

تحقیقی نتیجہ

اس پورے باب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اربعین، ۲۸ صفر اور ۸ ربیع الاول جیسے ایام کی اپنی اپنی تاریخی اور مذہبی بنیادیں موجود ہیں، لیکن محرم سے ۸ ربیع الاول تک مسلسل ایک متصل "دورِ عزا" کی صورت پہلی صدی ہجری کے نصوص میں نہیں ملتی۔ یہ شیعہ مذہبی تاریخ کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے، جسے علماء اور متدین معاشروں نے اہل بیتؑ کی مسلسل مصائب کی یاد کے تناظر میں اختیار کیا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا نہ اس روایت

کی نفی ہے اور نہ اس کی بے قدری، بلکہ اصل نصوص اور بعد کی مذہبی روایت کے درمیان علمی امتیاز کو واضح کرنا ہے۔

اہم مراجع

- تہذیب الأحکام۔
- مصباح المتہجد۔
- اللہوف۔
- إقبال الأعمال۔
- تاریخ الطبری۔
- الکامل فی التاریخ۔
- بحار الأنوار۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔

باب یازدہم

علم، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، پنجہ، سبیل، سیاہ لباس، ماتم اور دیگر شعائرِ حسینی کی تاریخی ابتدا اور فقہی حیثیت

اس پوری کتاب میں اب ہم ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں جہاں سب سے زیادہ سوالات اٹھتے ہیں۔ ایک عام شیعہ جب بچپن سے محرم دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ تصور بن جاتا ہے کہ علم، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، پنجہ، سبیل، سیاہ لباس، سینہ زنی، زنجیر زنی، شمعیں، نذر و نیاز، شبیہ، عَلَم کشائی اور دیگر تمام رسوم ہمیشہ سے اسی صورت میں موجود تھیں۔ لیکن جب ایک محقق قدیم حدیثی اور تاریخی مصادر کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض شعائر کی جڑیں پہلی صدی تک پہنچتی ہیں، بعض کی بنیاد دوسری اور تیسری صدی میں ملتی ہے، جبکہ بعض اپنی موجودہ شکل میں صفوی، عثمانی، قاجاری یا برصغیر کے ادوار میں تشکیل پائے۔

یہ فرق سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ فقہِ امامیہ میں کسی عمل کی شرعی حیثیت صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ کب شروع ہوا، بلکہ اس بات پر بھی

ہے کہ وہ کس عنوان کے تحت انجام دیا جارہا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اور کیا وہ شریعت کے کسی قطعی حکم سے متصادم تو نہیں۔

علم (پرچم)

علم شاید عزاداری کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ عوامی تصور میں اسے حضرت عباسؑ کے علم کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اصل تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جنگی پرچم (رایہ اور لواء) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے موجود تھے۔ غزوات میں مختلف پرچم استعمال ہوتے تھے اور حضرت علیؑ سمیت کئی صحابہ کو پرچم برداری کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ کربلا میں بھی حضرت عباسؑ کے علمبردار ہونے کا ذکر متعدد مقتلوں میں ملتا ہے، لہٰذا علمبرداری ایک تاریخی حقیقت ہے۔

لیکن جو علم آج امام بارگاہوں میں نصب کیا جاتا ہے، جس پر پنجہ، دھاتی ساخت، مخملی غلاف، کڑھائی، کلس یا دیگر تزئینی اجزاء ہوتے ہیں، اس کی موجودہ ہیئت پہلی صدی کے مصادر میں نہیں ملتی۔ مؤرخین کا رجحان یہ ہے کہ علامتی علم صفوی دور میں زیادہ منظم ہوا اور پھر برصغیر میں اسے خاص ثقافتی شکل ملی۔

فقہی اعتبار سے فقہائے امامیہ نے علم کو بذاتِ خود عبادت قرار نہیں دیا، بلکہ اگر اسے حضرت عباسؑ اور کربلا کی یاد کی علامت کے طور پر رکھا جائے اور اس کے ساتھ کوئی غیر شرعی عقیدہ وابستہ نہ کیا جائے تو اسے شعائرِ حسینی کے عنوان سے جائز سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے کسی معتبر فقیہ نے یہ نہیں کہا کہ علم کی زیارت بذاتِ خود واجب یا مستقل عبادت ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک علامتی شعیرہ کی ہے۔

اس سلسلے میں آیت اللہ سید علی خامنہ ای، آیت اللہ سید علی سیستانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کے استفتاءات سے یہی اصول سامنے آتا ہے کہ اصل معیار تعظیمِ شعائر اور شرعی حدود کی رعایت ہے، نہ کہ کسی مخصوص مادی شکل کی تقدیس۔

ذوالجناح

ذوالجناح کے بارے میں عوام میں شدید جذبات پائے جاتے ہیں، لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے چند امور الگ الگ سمجھنے چاہییں۔

پہلا یہ کہ امام حسینؑ کے گھوڑے کا وجود تاریخی طور پر ثابت ہے، اگرچہ اس کے نام اور بعض جزئیات کے بارے میں روایات میں اختلاف ملتا ہے۔ متعدد

مقتلوں میں یہ ذکر ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد گھوڑا خیموں کی طرف واپس آیا، جسے اہل بیتؑ نے دیکھ کر مصیبت کی شدت کو محسوس کیا۔

دوسرا یہ کہ جلوس میں ایک آراستہ گھوڑے کو "ذوالجناح" کے طور پر نکالنا قدیم حدیثی روایات میں موجود نہیں۔ اس رسم کی موجودہ صورت صفوی دور اور خصوصاً برصغیر میں فروغ پاتی نظر آتی ہے۔ اس لیے فقہی لحاظ سے یہ ایک عرفی علامت ہے، نہ کہ منصوص عبادت۔

اکثر معاصر فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ غلو، غیر شرعی عقائد یا ایسے افعال شامل نہ ہوں جو توحید یا امامت کے صحیح عقیدے سے متصادم ہوں۔

تعزیہ اور تابوت

تعزیہ برصغیر کی سب سے منفرد مذہبی روایتوں میں سے ہے۔ اس سے مراد امام حسینؑ یا شہدائے کربلا کے روضے کی علامتی شبیہ یا تابوت کی علامتی ساخت ہے، جسے جلوس میں لے جایا جاتا ہے۔

قدیم عربی مصادر میں اس رسم کا ذکر نہیں ملتا۔ ایران میں صفوی اور پھر قاجار دور میں شبیہ خوانی اور تعزیہ نے ترقی کی، جبکہ برصغیر میں یہ ایک الگ ثقافتی روایت بن گئی۔

فقہاء نے تعزیہ کے بارے میں دو اصول بیان کیے ہیں۔ اگر اسے صرف یادگار اور علامت سمجھا جائے، اس کے ساتھ عبادت کا مستقل عنوان وابستہ نہ کیا جائے اور اس میں کوئی غیر شرعی عمل شامل نہ ہو تو اس میں اصولاً ممانعت نہیں۔ لیکن اگر تعزیہ کو بذاتِ خود متبرک شے سمجھ کر اس کے بارے میں ایسے عقائد اختیار کیے جائیں جن کی شرعی دلیل نہ ہو، یا اس کے ساتھ خرافات شامل ہو جائیں، تو فقہاء نے ان کی تائید نہیں کی۔

سید محسن امین نے التنزیہ لأعمال الشبیہ میں اسی پہلو پر تنقید کی، جبکہ بعد کے علماء نے بھی اصل معیار کو شرعی حدود ہی قرار دیا۔

پنجہ

پنجہ برصغیر اور بعض ایرانی علاقوں میں علم کے اوپر نصب کیا جاتا ہے۔ عوام میں اسے اہلِ کساء یا حضرت عباسؑ کے علم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے پنجہ کی موجودہ ہیئت پہلی صدی کے اسلامی مصادر میں نہیں ملتی۔ غالب امکان یہی ہے کہ یہ ایک علامتی فنّی ارتقاء ہے جو بعد کی صدیوں میں وجود میں آیا۔

فقہی اعتبار سے بھی اس کی حیثیت مستقل عبادت کی نہیں، بلکہ اگر اسے محض علامت سمجھا جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ لیکن اگر اس کے ساتھ غیر ثابت عقائد وابستہ کیے جائیں تو وہ الگ فقہی بحث ہے۔

سبیل

سبیل کا معاملہ نسبتاً مختلف ہے، کیونکہ اس کی بنیاد صرف علامت نہیں بلکہ ایک حقیقی اسلامی عمل بھی ہے۔ قرآن و سنت میں پانی پلانے، مسافروں کی خدمت کرنے اور پیاسوں کو سیر اب کرنے کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ کربلا کے تناظر میں جب حضرت عباسؑ اور اہلِ بیتؑ کی پیاس کی یاد شامل ہو گئی تو سبیل اس مصیبت کی یاد کا ذریعہ بھی بن گئی۔

اس لیے فقہاء نے سبیل کو عام طور پر ایک مستحب خدمت قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں دو عنوان جمع ہو جاتے ہیں: صدقہ اور شعائرِ حسینی۔

تحقیقی نتیجہ

علم، ذوالجناح، تعزیہ، تابوت، پنجہ اور سبیل میں ایک مشترک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے کسی کی موجودہ ہیئت پہلی صدی ہجری میں ثابت نہیں، لیکن ان سب کا مقصد واقعۂ کربلا کی یاد کو زندہ رکھنا ہے۔ فقہائے امامیہ نے

بھی عموماً ان کی مشروعیت کو اسی عنوان سے دیکھا ہے۔ انہوں نے ان میں سے کسی کو توقیفی عبادت قرار نہیں دیا، بلکہ عرفی شعائر یا وسائلِ احیائے امرِ اہل بیتؑ کے طور پر ان کی جانچ کی ہے۔ اس لیے ان کی شرعی حیثیت ان کے مقصد، کیفیت اور شرائط کے ساتھ وابستہ ہے، نہ کہ صرف ان کے تاریخی وجود یا عدمِ وجود کے ساتھ۔

اہم مراجع

- التنزیہ لأعمال الشبیہ۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔
- The Martyrs of Karbala۔
- An Introduction to Shi'i Islam۔
- الإرشاد۔
- اللھوف علی قتلی الطفوف۔

باب دوازدہم

سیاہ لباس، سینہ زنی، نوحہ، مرثیہ، زنجیر زنی، قمہ زنی، نذر و نیاز اور لنگر: تاریخی ارتقاء اور فقہی حیثیت

اب ہم ان شعائر کی طرف آتے ہیں جو عام شیعہ معاشرے میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق براہِ راست ائمۂ اہل بیتؑ کی روایات سے ہے، جبکہ بعض اپنی موجودہ شکل میں صدیوں بعد وجود میں آئے۔ ایک محقق کا کام ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کرنا ہے، تاکہ نہ ہر نئی چیز کو بلا دلیل "بدعت" کہا جائے اور نہ ہر رائج رسم کو بلا تحقیق "سنتِ معصومؑ" قرار دیا جائے۔

سیاہ لباس کی ابتدا

آج محرم اور صفر میں سیاہ لباس پہننا پوری شیعہ دنیا میں عزاداری کی سب سے نمایاں علامت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی بنیاد ائمۂ اہل بیتؑ کی تعلیمات میں موجود ہے؟

اسلامی روایات میں عمومی طور پر سیاہ لباس کو پسندیدہ رنگ نہیں سمجھا گیا، کیونکہ بعض ادوار میں سیاہ لباس عباسی حکومت کی سرکاری علامت بن چکا تھا۔ اسی لیے بعض احادیث میں سیاہ لباس سے اجتناب کی ترغیب ملتی ہے، لیکن انہی روایات میں چند استثنائی صورتیں بھی بیان ہوئی ہیں، جیسے عمامہ، عبا اور جوتے وغیرہ۔

اہل بیتؑ کی عزاداری کے حوالے سے متعدد تاریخی روایات ملتی ہیں کہ واقعۂ کربلا کے بعد بنو ہاشم کی خواتین نے سیاہ لباس پہنا اور طویل عرصہ تک غم منایا۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہاشمی خواتین نے سیاہ لباس پہنا اور گرمی و سردی کی پروا کیے بغیر عزاداری جاری رکھی، یہاں تک کہ امام زین العابدینؑ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتے تھے۔

اس روایت کو شیخ صدوق، شیخ طوسی اور بعد کے علماء نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے، اگرچہ اس کی اسنادی حیثیت پر محدثین کے درمیان گفتگو بھی موجود ہے۔ تاہم مجموعی طور پر فقہائے امامیہ نے اس روایت اور عرفِ متشرعہ کی بنیاد پر ایامِ عزا میں سیاہ لباس پہننے کو جائز بلکہ اظہارِ غم کے عنوان سے مستحب قرار دیا ہے۔

حوالہ:

- بحار الأنوار، ج45۔
- وسائل الشیعۃ۔

سینہ زنی (لطم)

اگر کوئی رسم براہِ راست قدیم تاریخی روایات سے جڑی ہوئی ہے تو وہ لطم یعنی سینہ پیٹنا ہے۔

عربی زبان میں "لطم" کا مطلب چہرے یا سینے پر غم کے اظہار کے لیے ہاتھ مارنا ہے۔

قدیم اسلامی تاریخ میں یہ غم کے اظہار کی ایک معروف صورت تھی۔

واقعۂ کربلا کے بعد متعدد روایات میں آیا ہے کہ حضرت زینبؑ، دیگر خواتین اور اہل بیتؑ نے شدید غم میں اپنے سروں اور سینوں پر ہاتھ مارے۔

مثلاً سید ابن طاؤس اللھوف علی قتلی الطفوف میں حضرت زینبؑ کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے مصیبت کے عالم میں اپنے سر کو محمل سے ٹکرایا۔

اسی طرح دیگر مقتلوں میں اہل بیتؑ کے گریہ، بین اور اظہارِ غم کا ذکر ملتا ہے۔

اگرچہ ان تمام جزئیات کی اسنادی حیثیت ہر روایت میں یکساں نہیں، لیکن مجموعی طور پر لطم قدیم ترین شعائر میں شمار ہوتا ہے۔

موجودہ اجتماعی سینہ زنی

آج جس انداز سے ہزاروں افراد ایک مخصوص نوحے کی لے پر اجتماعی طور پر سینہ زنی کرتے ہیں، یہ صورت پہلی صدی میں موجود نہیں تھی۔

یہ اجتماعی نظم صفوی دور میں زیادہ منظم ہوا اور برصغیر میں اپنے عروج کو پہنچا۔

لہٰذا یہاں بھی وہی فرق برقرار رہتا ہے:

اصلِ لطم قدیم ہے۔

موجودہ اجتماعی ہیئت تاریخی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

نوحہ خوانی

امام جعفر صادقؑ نے ایسے شعراء کی حوصلہ افزائی فرمائی جو امام حسینؑ کے مصائب بیان کرتے تھے۔

مشہور شاعر جعفر بن عفان، کمیت بن زید اور دعبل خزاعی نے ائمہؑ کی موجودگی میں مراثی پڑھے۔

امام رضاؑ نے دعبل خزاعی سے فرمایا:

"ہمارے لیے شعر پڑھو، کیونکہ یہ دن ہمارے غم کے دن ہیں۔"

حوالہ:

- عیون أخبار الرضا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ اور نوحہ کی اصل سنت ائمہؑ کے زمانے سے موجود ہے۔

موجودہ نوحے

آج کے نوحے، مخصوص بحریں، اجتماعی جواب، مائیک، دھن، اور طرزیں بعد کی صدیوں میں وجود میں آئیں۔

فقہاء نے ان کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ:

- موسیقیِ حرام شامل نہ ہو۔
- جھوٹے واقعات بیان نہ کیے جائیں۔
- غلو نہ ہو۔

- عقائدِ صحیحہ کے خلاف کوئی مضمون نہ ہو۔

مرثیہ

مرثیہ عربی زبان میں پہلے سے موجود تھا۔

بعد میں فارسی نے اسے وسعت دی۔

لیکن اردو مرثیہ نے اسے دنیا کے بلند ترین ادبی مقام تک پہنچایا۔

میر انیس

اور

مرزا دبیر

نے مرثیے کو صرف مصیبت نامہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اخلاق، شجاعت، معرفت، صبر اور آزادی کی درسگاہ بنا دیا۔

اسی وجہ سے بہت سے علماء نے اردو مرثیے کو تبلیغِ اہل بیتؑ کا مؤثر ذریعہ قرار دیا۔

زنجیر زنی

اب ہم ایک حساس موضوع کی طرف آتے ہیں۔

تاریخی طور پر موجودہ زنجیر زنی پہلی صدی، دوسری صدی یا تیسری صدی کے معتبر مصادر میں موجود نہیں۔

محققین کا رجحان یہی ہے کہ اس کی موجودہ صورت صفوی دور کے بعد زیادہ نمایاں ہوئی۔

خصوصاً قاجاری ایران اور برصغیر میں اس کا فروغ ہوا۔

اس لیے اسے معصومینؑ کے زمانے کی سنت قرار دینا درست نہیں۔

فقہاء کا موقف

یہاں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض فقہاء نے معمولی ضرر کی صورت میں اسے جائز قرار دیا۔

بعض نے احتیاط کی۔

اور بعض معاصر فقہاء نے موجودہ عالمی حالات میں اس سے اجتناب کو ترجیح دی۔

اس اختلاف کی بنیاد روایت نہیں بلکہ عنوانِ ثانوی ہے۔

قمہ زنی

قمہ زنی کے بارے میں تاریخی صورتحال زنجیر زنی سے بھی زیادہ واضح ہے۔
قدیم شیعہ حدیثی ذخیرے میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔
یہ رسم غالباً صفوی یا اس کے بعد کے ادوار میں سامنے آئی۔
اسی لیے معاصر فقہاء میں اس پر سب سے زیادہ اختلاف ہے۔
مثلاً:

- آیت اللہ خامنہ ای موجودہ حالات میں اسے جائز نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ اسلام کی بدنامی کا سبب بنتی ہے۔
- آیت اللہ سیستانی عمومی اصول بیان کرتے ہیں کہ اگر قابلِ توجہ ضرر یا وھنِ مذہب ہو تو جائز نہیں۔
- بعض دیگر فقہاء نے مخصوص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔

لہٰذا یہاں اختلاف کا سبب روایت نہیں بلکہ موضوع کی تشخیص ہے۔

نذر و نیاز

اہل بیتؑ کے نام پر کھانا تقسیم کرنا بذاتِ خود کوئی نئی عبادت نہیں۔
اسلام میں:

- صدقہ،

- اطعام،
- مہمان نوازی،
- مساکین کو کھانا کھلانا،

پہلے ہی مستحب اعمال ہیں۔

جب یہی اعمال امام حسینؑ کی یاد کے ساتھ انجام دیے جانے لگے تو انہوں نے شعائرِ حسینی کی شکل اختیار کر لی۔

اس لیے فقہاء نے عمومی طور پر نیاز کو جائز بلکہ باعثِ ثواب قرار دیا، بشرطیکہ اس میں کوئی حرام عقیدہ شامل نہ ہو۔

لنگر

لنگر دراصل اجتماعی اطعام کی ایک شکل ہے۔

قدیم اسلامی معاشروں میں بھی اجتماعی کھانے کا انتظام موجود تھا۔

محرم میں لنگر کی موجودہ تنظیم بعد کی صدیوں میں سامنے آئی۔

اس کی شرعی حیثیت اطعامِ مؤمنین، صدقہ اور شعائرِ حسینی کے مجموعے سے بنتی ہے۔

شمعیں جلانا

شامِ غریباں میں شمعیں روشن کرنا یا بجھانا پہلی صدی کے مصادر میں نہیں ملتا۔
یہ ایک علامتی ثقافتی روایت ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئی۔
اگر اسے محض مصیبت کی علامت سمجھا جائے تو فقہی طور پر مباح ہے۔
لیکن اگر اسے شرعی عبادت سمجھا جائے تو اس کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں۔

مجموعی تحقیقی نتیجہ

ان تمام شعائر کے تاریخی مطالعے سے ایک واضح اصول سامنے آتا ہے۔ سیاہ لباس، گریہ، مرثیہ اور لطم کی جڑیں ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے تک پہنچتی ہیں، اگرچہ ان کی موجودہ اجتماعی شکلیں بعد میں منظم ہوئیں۔ اس کے برعکس علم، ذوالجناح، تعزیہ، زنجیر زنی، قمہ زنی، شمعیں اور بہت سی دیگر موجودہ رسوم اپنی موجودہ ہیئت میں بعد کی صدیوں کی پیداوار ہیں۔ فقہائے امامیہ نے ان کی مشروعیت کا فیصلہ ان کی تاریخی قدامت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ قرآن، سنت، شعائرِ الٰہی، احیائے امرِ اہل بیتؑ، اصلِ اباحت، عنوانِ ثانوی اور مصلحتِ اسلام جیسے فقہی اصولوں کی روشنی میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض رسوم پر فقہاء کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے، جبکہ اصل

عزاداری، مجالس، گریہ، مرثیہ اور ذکرِ مصائب پر ان کے درمیان وسیع اتفاق موجود ہے۔

اہم مراجع

- وسائل الشیعۃ۔
- بحار الأنوار۔
- عیون أخبار الرضا۔
- اللھوف علی قتلی الطفوف۔
- التنزیہ لأعمال الشبیہ۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔

باب سیز دہم

بدعت اور شعیرہ میں فرق: فقہِ جعفری کی روشنی میں عزاداری کا مستقبل

اس پوری کتاب میں ہم نے ایک بنیادی حقیقت کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا میں ہم نے دیکھا کہ خود ائمۂ اہل بیتؑ کے زمانے میں عزاداری کی اصل بنیادیں کیا تھیں۔ پھر یہ جانا کہ آلِ بویہ، صفویہ، قاجاریہ اور برصغیر کے مختلف ادوار میں عزاداری کی موجودہ صورتیں کس طرح تدریجاً وجود میں آئیں۔ اس کے بعد فقہائے جامع الشرائط کے اصول، ان کی آراء، مختلف رسوم کی تاریخی حیثیت اور ان کے فقہی تجزیے کا جائزہ لیا۔ اب آخری سوال باقی رہ جاتا ہے، اور شاید یہی اس پوری تحقیق کا سب سے اہم سوال ہے۔

اگر آئندہ بھی عزاداری میں کوئی نئی صورت پیدا ہو تو کیا وہ جائز ہو گی؟ اور آخر وہ معیار کیا ہے جس کی بنیاد پر کسی عمل کو "شعیرہ" یا "بدعت" کہا جائے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کے بغیر پوری بحث ادھوری رہتی ہے۔

بدعت کا حقیقی مفہوم

عام طور پر ہمارے معاشرے میں ہر نئی چیز کو بدعت کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ فقہِ امامیہ اور اصولِ فقہ میں بدعت کی تعریف اس سے کہیں زیادہ دقیق ہے۔

علمائے امامیہ کے نزدیک بدعت یہ نہیں کہ کوئی چیز پہلے موجود نہ ہو، بلکہ بدعت یہ ہے کہ کسی ایسے عمل کو دین کا حصہ قرار دیا جائے جسے اللہ اور رسولؐ نے دین کا حصہ قرار نہ دیا ہو۔

علامہ حلی، شہید ثانی، شیخ انصاری اور دیگر اصولیین نے بدعت کی اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نمازِ ظہر کی چار کے بجائے پانچ رکعتیں ہیں، تو یہ بدعت ہے، کیونکہ اس نے توقیفی عبادت میں اضافہ کیا۔

لیکن اگر کوئی شخص قرآن کی تعلیم کے لیے پرنٹنگ پریس، مائیکروفون، انٹرنیٹ یا موبائل ایپ استعمال کرے تو یہ بدعت نہیں، کیونکہ اس نے عبادت میں اضافہ نہیں کیا بلکہ عبادت کے ایک جائز وسیلے کو اختیار کیا ہے۔

اسی فرق کو سمجھے بغیر عزاداری پر ہونے والی بہت سی بحثیں الجھ جاتی ہیں۔

شعیرہ کیا ہے؟

قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾

"جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔"

(سورۂ حج:32)

فقہائے امامیہ نے اس آیت سے یہ اصول اخذ کیا کہ شعیرہ وہ چیز ہے جو اللہ، دین اور اس کی عظیم اقدار کی علامت بن جائے۔ لیکن کسی نئی چیز کو شعیرہ قرار دینے کے لیے صرف عوامی رواج کافی نہیں، بلکہ اس کا مقصد، اس کا اثر اور اس کی شرعی حیثیت بھی دیکھی جائے گی۔

اسی لیے ہر رواج شعیرہ نہیں ہوتا، اور ہر شعیرہ بھی ہمیشہ ایک ہی شکل میں باقی نہیں رہتا۔

شعائر کا ارتقاء: ایک فطری عمل

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں شعائر کی ظاہری صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ ائمہؑ کے زمانے میں نہ لاؤڈ اسپیکر تھا، نہ ریڈیو، نہ ٹیلی ویژن، نہ انٹرنیٹ، نہ ڈیجیٹل اسکرینیں، نہ سوشل میڈیا اور نہ ہی لاکھوں افراد پر مشتمل منظم جلوس۔

آج یہ سب موجود ہیں، اور انہی ذرائع سے قرآن، نہج البلاغہ، صحیفۂ سجادیہ، مجالسِ حسینی اور زیارات پوری دنیا تک پہنچ رہی ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ چونکہ یہ ذرائع پہلی صدی میں موجود نہیں تھے، اس لیے ان کا استعمال بدعت ہے، تو فقہِ امامیہ اس استدلال کو قبول نہیں کرتی۔

اسی اصول کو عزاداری کی بہت سی جدید صورتوں پر بھی منطبق کیا جاتا ہے۔

شعائر کی شرعی حدود

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر نئی رسم خود بخود جائز ہو جائے۔

فقہائے امامیہ نے چند بنیادی شرائط بیان کی ہیں۔

اگر کوئی نئی رسم:

دین کی تبلیغ کرے،

امام حسینؑ کے پیغام کو زندہ کرے،

لوگوں کو ظلم کے خلاف آمادہ کرے،

اہل بیتؑ سے محبت پیدا کرے،

شریعت کے کسی قطعی حکم سے متصادم نہ ہو،

جھوٹ، غلو، خرافات یا شرک پر مشتمل نہ ہو،

اور اسلام کی توہین کا ذریعہ نہ بنے،
تو اصولی طور پر اس کے جواز پر گفتگو ہو سکتی ہے۔
لیکن اگر یہی رسم:
واجبات کے ترک کا سبب بن جائے،
حرام امور پر مشتمل ہو،
غیر مستند تاریخی واقعات کو دین بنا دے،
انسانی جان کو بلاوجہ نقصان پہنچائے،
فرقہ واریت یا نفرت کو ہوا دے،
یا اسلام کے چہرے کو مسخ کرے،
تو فقہاء انہی اصولوں کی بنیاد پر اس سے منع بھی کر سکتے ہیں۔
یہی فقہِ جعفری کا توازن ہے۔

کیا ہر قدیم رسم ہمیشہ باقی رہے گی؟

یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔
جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں۔

فقہ میں ایک اصول ہے کہ موضوع کے بدلنے سے حکم کے اطلاق میں بھی تبدیلی آسکتی ہے۔

مثلاً اگر کسی دور میں ایک رسم تبلیغِ دین کا مؤثر ذریعہ تھی، لیکن بعد میں وہی رسم اسلام کی بدنامی کا سبب بننے لگے، تو فقیہ عنوانِ ثانوی کی بنیاد پر اس کے بارے میں مختلف حکم دے سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی نئی چیز پہلے موجود نہ تھی لیکن بعد میں تبلیغ کا بہترین ذریعہ بن جائے تو وہ قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔

اسی اصول کی بنیاد پر مختلف زمانوں میں بعض فقہی فتاویٰ میں جزوی اختلاف نظر آتا ہے۔

عزاداری کا اصل مقصد

اس پوری بحث میں شاید سب سے اہم سوال یہی ہے کہ امام حسینؑ نے شہادت کیوں دی؟

اگر عزاداری ہمیں صرف رُلانا سکھائے لیکن ظلم کے خلاف کھڑا نہ کرے، تو مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔

اگر مجالس ہمیں صرف مصائب سنائیں لیکن قرآن، عدل، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، حریت، انسانی کرامت اور الٰہی حکومت کا شعور نہ دیں، تو ہم امام حسینؑ کے مقصد سے دور ہو جائیں گے۔

ائمۂ اہل بیتؑ نے صرف گریہ کی دعوت نہیں دی بلکہ احیائے امر کی دعوت دی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

» رَحِمَ اللهُ مَنْ أَحْيَا أَمْرَنَا «

"اللہ اس شخص پر رحم کرے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔"

جب راوی نے پوچھا کہ امر کو کیسے زندہ کیا جائے؟

تو فرمایا:

"ہماری احادیث سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔"

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ عزاداری کا مقصد صرف جذبات پیدا کرنا نہیں بلکہ معرفت پیدا کرنا بھی ہے۔

حوالہ:

- الأمالي۔
- وسائل الشيعة۔

اس تحقیق کا خلاصہ

اس پوری کتاب کے تحقیقی نتائج کو اگر چند جملوں میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہیں:

اصل عزاداری، گریہ، مرثیہ، زیارت، ذکرِ مصائب اور امام حسینؑ کی یاد ائمۂ اہل بیتؑ کی مستند تعلیمات سے ثابت ہے۔

موجودہ عزاداری کی بہت سی عملی صورتیں، جیسے علم، ذوالجناح، تعزیہ، موجودہ جلوس، امام بارگاہوں کی موجودہ ساخت، نوحہ خوانی کی منظم شکل، مرثیہ کی اردو روایت، سبیلوں کی تنظیم اور بہت سی دیگر رسوم، اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں تدریجاً تشکیل پائیں۔

فقہائے امامیہ نے ان رسوم کی مشروعیت کا فیصلہ ان کی تاریخی قدامت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ قرآن، سنت، اصولِ فقہ، شعائرِ الٰہی، احیائے امر اہل بیتؑ، اصلِ اباحت، عرفِ متشرعہ اور مصلحتِ اسلام کی بنیاد پر کیا۔

اسی وجہ سے بعض رسوم پر فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن اصل عزاداری کے استحباب اور مشروعیت پر ان کے درمیان وسیع اتفاق موجود ہے۔

اس تحقیق کا مقصد نہ کسی شعیرے کی توہین ہے، نہ کسی مذہبی روایت کی نفی، بلکہ اصل نصوص، تاریخی ارتقاء اور فقہی تجزیے کے درمیان فرق کو واضح کرنا ہے تاکہ عزاداری کا تعلق صرف جذبات سے نہیں بلکہ علم، بصیرت اور معرفت سے بھی مضبوط ہو۔

اختتامی کلمات

امام حسینؑ نے کربلا میں کوئی جامد رسم نہیں چھوڑی، بلکہ ایک زندہ مکتب چھوڑا۔ اس مکتب کی روح حق کی نصرت، ظلم کی مخالفت، انسانی کرامت، الٰہی عدالت، اخلاقی استقامت اور خدا کی رضا ہے۔ اگر ہر دور کا شیعہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہی اصولوں کو زندہ رکھنے کے لیے نئے، جائز اور مؤثر ذرائع اختیار کرے، اور ساتھ ہی دین کی اصل تعلیمات اور فقہی حدود کی پابندی بھی کرے، تو یہی عزاداری کی حقیقی روح اور شعائرِ حسینی کی بقا ہے۔

اہم مراجع

- فرائد الأصول۔
- المکاسب۔

- کفایۃ الأصول۔
- المیزان فی تفسیر القرآن۔
- وسائل الشیعۃ۔
- الأمالي۔
- تاریخ عزاداری امام حسینؑ۔
- حماسۂ حسینی۔

باب چہاردہم (اختتامی باب)

ائمۂ اہل بیتؑ عزاداری سے کیا چاہتے تھے؟ رسم سے مقصد تک کا سفر

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کوئی بھی مذہبی روایت صرف اس وقت زندہ رہتی ہے جب اس کے ظاہری مظاہر کے ساتھ اس کی روح بھی محفوظ رہے۔ اگر ظاہری شکل باقی رہے لیکن مقصد گم ہو جائے تو رفتہ رفتہ وہ روایت اپنی اصل تاثیر کھو دیتی ہے۔ یہی اصول عزاداری پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اگر ہم رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت فاطمہ زہراؑ، ائمۂ اہل بیتؑ اور خصوصاً امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی تعلیمات کا مجموعی مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف گریہ کرنے کی دعوت نہیں دی بلکہ ایک ایسے فکری، اخلاقی اور اجتماعی نظام کی بنیاد رکھی جس میں گریہ ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔

اسی لیے جب امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

» أحیوا أمرنا «

"ہمارے امر کو زندہ رکھو۔"

تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ "امرِ اہل بیتؑ" کیا ہے؟

اگر اس روایت کا اگلا حصہ دیکھا جائے تو امامؑ خود جواب دیتے ہیں:

"ہماری احادیث سیکھو، لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبیوں کو جان لیں تو ہماری پیروی کریں گے۔"

یہ روایت ایک بنیادی حقیقت واضح کرتی ہے کہ عزاداری کا مقصد صرف جذبات پیدا کرنا نہیں بلکہ معرفت پیدا کرنا ہے۔

حوالہ:

- الأمالي۔
- وسائل الشيعة۔

امام حسینؑ صرف مظلوم نہیں، رہبر بھی ہیں

عام طور پر ہماری مجالس میں امام حسینؑ کے مصائب بہت تفصیل سے بیان ہوتے ہیں، اور یقیناً یہ عزاداری کا اہم حصہ ہے، لیکن اگر انہی مجالس میں یہ نہ بتایا جائے کہ امام حسینؑ نے مدینہ کیوں چھوڑا، مکہ کیوں گئے، کوفہ والوں کے خطوط کی حقیقت کیا تھی، یزیدی حکومت کی فکری بنیاد کیا تھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم کیا تھا، اسلامی حکومت کی شرائط کیا ہیں، اور امامؑ کس

قسم کے معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے، تو عزاداری اپنے ایک بڑے مقصد سے محروم رہ جاتی ہے۔

خود امام حسینؑ نے اپنے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

» إني لم أخرج أشراً ولا بطراً... وإنما خرجت لطلب الإصلاح في أمة جدي « .

"میں نہ سرکشی کے لیے نکلا ہوں اور نہ فساد کے لیے، بلکہ اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔"

حوالہ:

- بحار الأنوار، ج44۔
- تحف العقول (مفہومِ روایت سے متعلق نقل)۔

اس اعلان سے واضح ہوتا ہے کہ کربلا صرف ایک المیہ نہیں بلکہ ایک اصلاحی تحریک بھی ہے۔

عزاداری کا مقصد صرف رونا نہیں، انسان بنانا ہے

اگر ہم ائمۂ اہل بیتؑ کی دعاؤں، خطبات اور تعلیمات کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے انسان کی تربیت چاہتے ہیں جو:

- سچا ہو۔

- عادل ہو۔
- امانت دار ہو۔
- ظلم سے نفرت کرے۔
- کمزور کا ساتھ دے۔
- خدا کی اطاعت کرے۔
- معاشرے کی اصلاح میں کردار ادا کرے۔

اگر عزاداری کے بعد انسان کی نماز، اخلاق، دیانت، معاشرت، تجارت، خاندان اور سماجی کردار میں کوئی تبدیلی نہ آئے تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم عزاداری کے اصل مقصد تک پہنچ سکے؟

اسی لیے شہید مطہری نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ عزاداری کا مقصد صرف آنسو نہیں بلکہ شعور پیدا کرنا ہے۔

حوالہ:

- حماسہ حسینی۔

عزاداری اور تہذیب سازی

تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ عزاداری نے صرف مذہبی اجتماع پیدا نہیں کیے بلکہ ایک مکمل تہذیب تشکیل دی۔

اسی عزاداری نے:

اردو مرثیہ پیدا کیا۔

نوحہ نگاری کو جنم دیا۔

امام بارگاہوں کا نظام قائم کیا۔

وقف، دسترخوان اور خدمتِ خلق کے ادارے بنائے۔

غریبوں کی کفالت کے مراکز پیدا کیے۔

دینی تعلیم کے حلقے قائم کیے۔

اس اعتبار سے عزاداری صرف ایک مذہبی عمل نہیں بلکہ ایک تمدنی قوت بھی ہے۔

ہر دور کی عزاداری کا اپنا چیلنج

پہلی صدی کا چیلنج یزید تھا۔

تیسری صدی کا چیلنج عباسی حکومت تھی۔

صفوی دور کا چیلنج شیعہ شناخت کا تحفظ تھا۔

برصغیر میں چیلنج مذہبی شناخت کی بقا تھا۔
آج کا چیلنج مختلف نوعیت کا ہے۔
آج الحاد، مادیت، اخلاقی بحران، میڈیا کی یلغار، خاندان کی کمزوری، صارفیت، فکری استعمار اور مصنوعی ذہانت کے دور میں دینی شناخت کا تحفظ ایک نیا امتحان ہے۔
لہٰذا اگر عزاداری آج بھی زندہ رہنا چاہتی ہے تو اسے صرف ماضی کا نوحہ نہیں بلکہ حال کی رہنمائی اور مستقبل کی تعمیر بھی بننا ہوگا۔

کیا عزاداری میں اصلاح کی گنجائش ہے؟

یہ سوال بعض لوگوں کو حساس محسوس ہوتا ہے، لیکن فقہی اور تاریخی اعتبار سے اس کا جواب مثبت ہے۔
ائمۂ اہل بیتؑ نے خود دین میں غلو، جھوٹ اور تحریف کی مخالفت کی۔
اسی اصول کی بنیاد پر فقہائے امامیہ نے بھی کہا کہ:

- غیر مستند واقعات بیان نہ کیے جائیں۔
- جھوٹے معجزات گھڑ کر نہ سنائے جائیں۔
- غلو سے اجتناب کیا جائے۔
- ایسی رسوم سے بچا جائے جو اسلام یا تشیع کی ساکھ کو نقصان پہنچائیں۔

- عزاداری کو قرآن، سیرتِ نبویؐ اور سیرتِ ائمہؑ سے جوڑا جائے۔

اس لیے اصلاح، عزاداری کی مخالفت نہیں بلکہ اس کی حفاظت ہے۔

اس باب کا حاصل

تاریخ، حدیث اور فقہ کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ اہل بیتؑ نے عزاداری کو ایک زندہ، متحرک اور اصلاحی تحریک کے طور پر دیکھا۔ گریہ، مرثیہ، ماتم اور مجالس اس تحریک کے ذرائع ہیں، جبکہ اصل مقصد احیائے دین، احیائے امرِ اہل بیتؑ، ظلم کے خلاف مزاحمت، اخلاقی تربیت، دینی بصیرت، اور الٰہی اقدار کی حفاظت ہے۔ جب بھی عزاداری ان مقاصد سے جڑی رہے گی، وہ اپنی حقیقی روح کے ساتھ زندہ رہے گی، اور اگر وہ صرف رسم تک محدود ہو جائے گی تو اس کے ظاہری مظاہر باقی رہیں گے لیکن اس کی انقلابی تاثیر کم ہوتی جائے گی۔

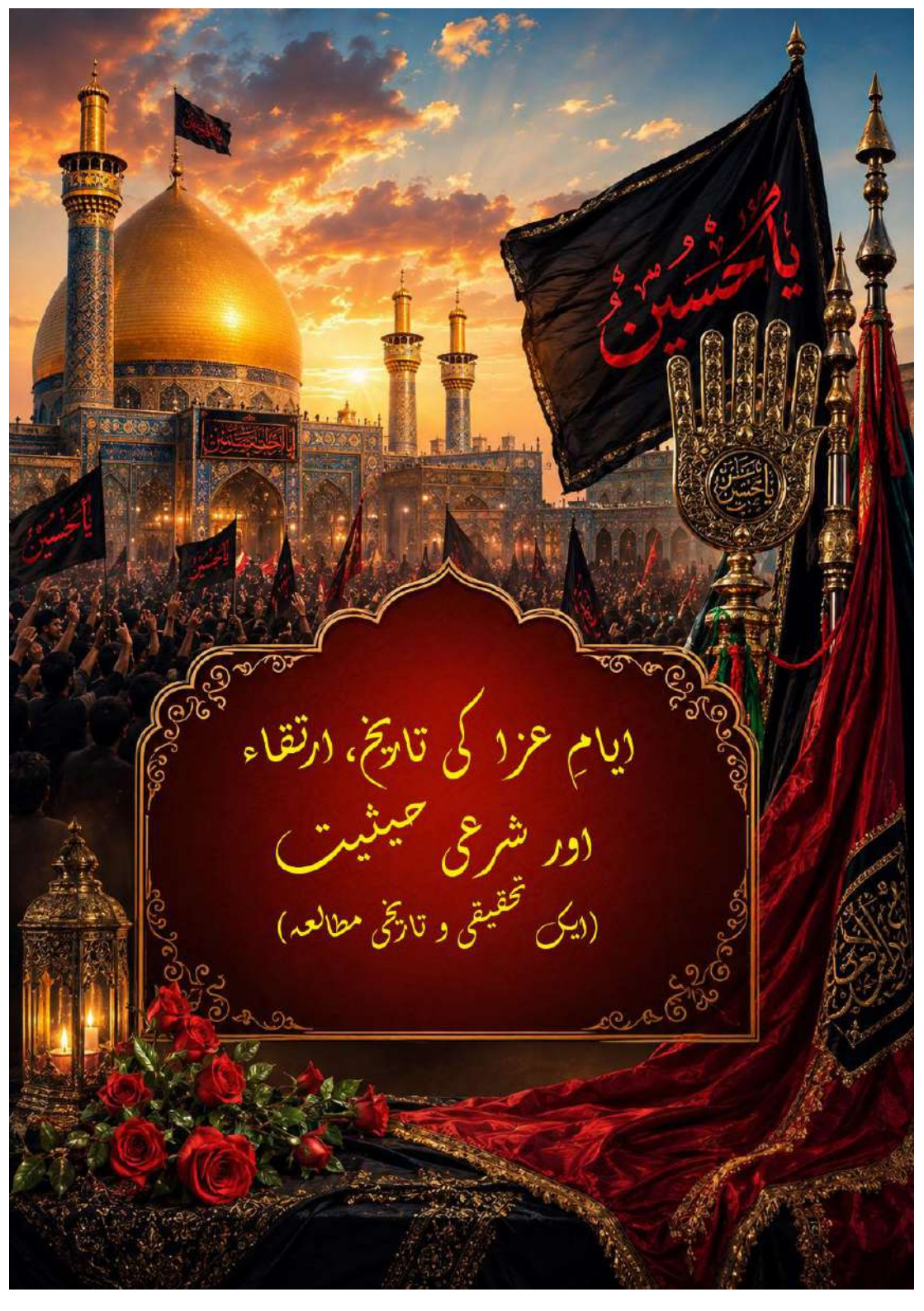

ایامِ عزا کی تاریخ، ارتقاء اور شرعی حیثیت

(ایک تحقیقی و تاریخی مطالعہ)